رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۳۰

جلد ۶۰ عدد ۱ — اپریل ۱۹۶۳ء

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵۔ اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور (پاکستان)

سالانہ چندہ ۶ روپے — قیمت فی پرچہ ۶۲ پیسے

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۶۰	اپریل ۱۹۶۳ء	عدد ۱

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن

اچھرہ، لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

امریکہ پاکستان کے مفادات کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے بھارت کو جو بے پناہ امداد دے رہا ہے، وہ نہ صرف بین الاقوامی معاملات میں مکروفریب اور بے وفائی کی ایک نہایت ہی عبرتناک داستان ہے بلکہ "چچا سام" کے فہم و فراست کے دیوالیہ پن کی بڑی واضح دلیل ہے اور اسے دیکھ کر اُس کے مستقبل کا آسانی کے ساتھ اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اس امداد سے ایشیا کے اندر طاقت کا توازن بالکل بگڑ کر رہ جائے گا جو بالآخر پوری دنیا کی سیاست کے اندر اختلال پیدا کر دیگا۔

بھارت شروع ہی سے جس پالیسی پر عمل کر رہا ہے وہ اُس کے استعماری عزائم کی کھلے طور پر نشاندہی کرتی ہے۔ امن اور آشتی کے اس علمبردار نے سب سے پہلے تو اُن بستیوں کو نگلنا شروع کیا جو کسی طرح بھی اس کی زد میں آسکتی تھیں، اور اس طرح اپنے پڑوسیوں پر عرصۂ حیات تنگ کرنے لگا۔ خصوصاً پاکستان کے ساتھ اُس نے جو جارحانہ رویّہ اختیار کر رکھا ہے اُس کی کسی اچھے اور شریف ہمسایہ سے توقع نہیں کی جاسکتی۔ پھر بین الاقوامی تعلقات میں اُس نے مختلف ممالک بالخصوص روس اور اینگلو امریکن بلاک کے ساتھ جو آنکھ مچولی کھیلی ہے اور ان دونوں طاقتوں سے اپنی عیاری کے ذریعہ جس طرح وہ فائدہ اٹھاتا رہا ہے، اُسے دیکھ کر اس بات کا بآسانی فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ اس ملک کے سربراہ کسی اخلاقی ضابطے کے پابند نہیں بلکہ صرف مادی مفارات کے پرستار ہیں۔ اس طرزِ عمل سے انہیں وقتی طور پر بلاشبہ کچھ فوائد حاصل ہوئے ہیں اور بڑے بڑے ممالک کو کسی حد تک بیوقوف بنانے میں انہیں تھوڑی سی کامیابی بھی نصیب ہوئی ہے۔ لیکن وہ لوگ جو تاریخ پر نگاہ رکھتے ہیں وہ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس طرح کا بے اصولا پن

کسی ملک اور قوم کو تادیر کامیابی سے ہمکنار نہیں رکھ سکتا۔ اگر کوئی قوم خود غرض بھی ہو تو کم از کم اسے بساطِ سیاست پر اپنے مفادات کے مہروں کو بیدار مغزی کے ساتھ چلانا پڑتا ہے اور اس راہ کی معمولی غفلت بھی تباہی و بربادی کا باعث بنتی ہے۔ خالقِ کائنات نے قوموں کے فنا و بقا میں اس امر کا خاص طور پر انتظام کر رکھا ہے کہ مستقل کامرانی انہیں لوگوں کے حصے میں آئے جو اخلاق کی ثنیت اقدار کے پابند ہوں۔ چالبازیاں اور عیاریاں وقتی طور پر کسی قوم کے لیے نفع کے حصول کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ لیکن ان کے بل بوتے پر آج تک کسی فرد یا گروہ نے زیادہ دیر تک قوت اور عزت حاصل نہیں کی۔ انسانی تعلقات کی بساط پر جتنی منافقانہ چالیں بھی چلی جائیں گی وہ ان چالیں چلنے والوں کو مختلف مصائب میں گرفتار کرتی چلی جائیں گی۔

گزشتہ دو صدیوں میں برطانیہ سے زیادہ شاطرانہ روش کس ملک نے اختیار کی ہے؟ لیکن اس کا جو عبرتناک انجام ہوا ہے وہ آج پوری دنیا کے سامنے ہے۔ مشرقی ممالک سے اس کا اثر بالکل ختم ہو کر رہ گیا ہے اور اس کی جگہ امریکہ اور روس دونوں حیرت انگیز سرعت کے ساتھ نفوذ کرتے جا رہے ہیں۔ سیاسی چالبازیاں "جان بل" کو گھیر گھار کر ایک ایسے مقام پر لے آئی ہیں جہاں وہ ایک پٹے ہوئے مہرے کی طرح بالکل بے بسی کے عالم میں اپنی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ اس کی کس مپرسی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ قوم جس کا کبھی یہ دعویٰ تھا کہ اس کی وسیع و عریض سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا اس کا آج یہ حال ہے کہ فرانس جیسا کمزور ملک بھی اسے منہ لگانے پر تیار نہیں ہے۔ یورپ کی مشترکہ منڈی کی تشکیل میں انگریز کو جس ذلت آمیز طریق سے نظر انداز کیا گیا ہے وہ شاطرانہ حربوں کے انجام پر نہایت کھلے طریق سے دلالت کرتا ہے۔

آج برطانیہ کا لے دے کر ایک ہی دمساز اور غم خوار رہ گیا ہے اور وہ امریکہ ہے۔ ان دونوں کے درمیان بعض ایسے تہذیبی رشتے موجود ہیں جن کی وجہ سے یہ دونوں قومیں ایک دوسرے

کے ساتھ کسی حد تک وابستگی محسوس کرتی ہیں لیکن بین الاقوامی حالات جس سُرعت کے ساتھ تبدیل ہو رہے ہیں اُسے دیکھتے ہوئے یہ تعلق بھی بالکل ناپائیدار معلوم ہوتا ہے۔ ان دونوں ممالک کے سیاسی اور معاشی مفادات کا آپس میں ٹکرانا بالکل ناگزیر ہے۔ اور مادیت پرستی کے اس دور میں یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ دنیا کی کوئی قوم تہذیبی تعلقات کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے سیاسی اور معاشی مفادات کو قربان کرنے پر آمادہ ہوجائے گی۔ چنانچہ لنکا کے معاملے میں برطانیہ نے جس طرح امریکہ سے صرفِ نظر کیا ہے اُس سے آنے والے حالات کے رُخ کا کسی حد تک اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اس وقت جو صورتِ حال پیدا ہو رہی ہے اس کے پیشِ نظر دنیا میں تین بلاک ابھر رہے ہیں۔ ایک امریکہ اور برطانیہ۔ دوسرا یورپ۔ اور تیسرا کمیونسٹ۔ مسلمان ممالک کے ایک الگ بلاک بننے کے نہایت واضح امکانات موجود تھے، لیکن افسوس کہ ان کے سربراہوں کی غفلت اور کوتاہ بینی نے اس چوتھے بلاک کی تشکیل کو کافی حد تک ناممکن بنا دیا ہے۔

اسلام جو مسلمانوں کی عظیم اکثریت کے لیے آج بھی فکر و عمل کا سب سے بڑا محرک اور اُن کے درمیان پائیدار تعلقات کے استوار کرنے کا واحد ذریعہ ہے، اُس کی گرفت آہستہ آہستہ ڈھیلی ہوتی جارہی ہے۔ اور اس کی جگہ مغرب کے ملحدانہ افکار و نظریات کو امتِ مُسلمہ کے دل و دماغ پر بالجبر ٹھونسنے کی مختلف سازشیں ہو رہی ہیں۔ اس سے مسلمان ممالک کے اندر ایک خلفشار موجود ہے۔ مصر، عراق، شام، پاکستان، افغانستان، انڈونیشیا اور ٹرکی، ان میں سے کوئی ملک بھی ایسا نہیں جس میں انتشار موجود نہ ہو۔ پاکستان کو چھوڑ کر دنیا کے تمام مسلمان ممالک میں افکار و نظریات کی یہ کشمکش کئی مرتبہ خون آشام انقلابات کی صورت اختیار کرچکی ہے لیکن ابھی تک وہاں کے رہنے والے اس بات کا کوئی حتمی فیصلہ نہیں کرپائے کہ انہیں اپنے مستقبل کی تعمیر کس بنیاد پر کرنی ہے۔ کیا وہ قلب و دماغ کی پوری یکسوئی کے ساتھ کفر کی راہ اختیار کریں گے یا وہ پورے اخلاص اور نیک نیتی کے ساتھ اسلام کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی اساس بنانے کے لیے کوئی مؤثر

قدم اٹھائیں گے مسلمان جب تک اس امر کا کوئی آخری فیصلہ نہیں کرتے اُس وقت تک اُن کا مستقبل کبھی روشن نہیں ہو سکتا۔ کفر و اسلام کے درمیان اس گومگو اور تذبذب کی پالیسی کی وجہ سے اُن کی طاقت روز بروز کمزور ہوتی چلی جائیگی اور اُن کی قوتیں ایک مرکز پر مجتمع ہونے کی بجائے منتشر رہیں گی جنہیں حوادث کے تھپیڑے جس طرف چاہیں گے اڑا کرلے جائیں گے۔

مصر، شام اور عراق کے اتحاد کو جو ابھی ابھی صدر ناصر کی زیر سرپرستی قائم ہوا ہے، بعض سادہ لوح دنیائے اسلام کے روشن مستقبل کی پہلی کرن تصوّر کرتے ہیں۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو اور مسلمان کسی ایک مرکز پر جمع ہو کر کفر کی یلغار کا مقابلہ کر سکیں۔ لیکن سطحی جذباتیت سے ہٹ کر جب ہم اس اتحاد کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس کی حیثیت ایک مقدس خواہش سے زیادہ کچھ بھی معلوم نہیں ہوتی ہمارے سامنے جو سوال سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ آج اس اتحاد کی بنیاد کیا ہے۔ وہ کونسا ایسا نصب العین ہے جس کی مقناطیسی کشش ان مائل بہ انتشار اجزاء کو باہم جوڑ کر انہیں ایک مضبوط قوت بنادے گا۔ اگر یہ عرب نیشنلزم ہے تو پھر ہم نہایت واضح طور پر یہ کہتے ہیں کہ یہ بنیاد بڑی بودی اور کمزور ہے۔ نیشنلزم میں اب اتنی طاقت نہیں رہی کہ اُس سے مختلف ممالک کے درمیان اتحاد کا کام لیا جاسکے۔ اور اگر اسی جذبہ کو قوت و طاقت کے زور سے ان ممالک میں اُبھارنے کی کوشش کی گئی تو مسلمانوں کے اندر مزید انتشار پیدا ہوگا۔

کسی اندرونی یا بیرونی خطرے کی وجہ سے ممکن ہے کہ یہ تھلے ،، یا ان میں سے چند ممالک وقتی طور پر باہم مل بیٹھیں۔ لیکن فی الواقع کوئی تعمیری قوت نہیں ہے جو ان ممالک کے رہنے والوں کے اندر فکر و نظر کی ہم آہنگی پیدا کر سکے، ان کی خفتہ قوتوں کو بیدار کرکے انہیں ترقی کی راہ پر لگادے اُن کے دل و دماغ میں جاہلی عصبیتوں کے جو جھاڑ جھنکار حیرت انگیز تیزی کے ساتھ اُبھر رہے ہیں، صاف کرکے وہاں نیکی اور شرافت کے بیج بو دے۔ افکار و نظریات اور احساسات و جذبات کا یہ ہمہ گیر انقلاب صرف اسلام کو پورے اخلاص کے ساتھ اپنانے ہی سے آسکتا ہے۔ لیکن ہمیں یہ بات

بڑے رنج کے ساتھ کہنی پڑتی ہے کہ اس اتحاد میں قوت و استحکام کے اس لازوال او رانقاد خزانے کو سب سے زیادہ نظر انداز کیا گیا ہے۔

پھر اس مصنوعی اتحاد کے پیدا کرنے میں جس قسم کی مسلسل سازشیں کی جارہی ہیں انہیں دیکھ کر اس کے متعلق کوئی اچھی توقعات وابستہ نہیں کی جا سکتیں۔ خفیہ انقلاب کے ذریعہ سے جو چند فوجی افسر اچانک برسر اقتدار آگئے ہوں ان کے باہم مل بیٹھنے سے تو مختلف ممالک کے لوگ باہم متحد نہیں ہو سکتے۔ اُن کے اندر کسی پائیدار اتحاد کی بنیاد رکھنے کے لیے یہ بات اشد ضروری ہے کہ سب سے پہلے عوام کے اندر اس کے لیے آمادگی پیدا کی جائے۔ یہ کوئی جوا نہیں ہے کہ کوئی طاقتور ہاتھ پکڑ کر لوگوں کی گردنوں پر ڈال دے اور اس طرح وہ باہم متحد رہنے پر مجبور کر دیے جائیں۔ اس کے لیے سب سے پہلے داخلی تبدیلی پیدا کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔ جو انقلابات جوڑ توڑ اور خفیہ سازشوں کے ذریعے معرضِ وجود میں آتے ہیں وہ قوموں کو طاقتور اور مضبوط بنانے کی بجائے انہیں زیادہ کمزور بنا دیتے ہیں۔ اور ایسے انقلابیوں کا اتحاد کبھی قوموں کا صحت مند اتحاد نہیں بن سکتا۔ درحقیقت اس وقت تمام عرب ممالک ایک آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر بیٹھے ہوتے ہیں اور اُن کی اجتماعی زندگی میں ہر وقت اچانک زلزلے آتے رہتے ہیں۔ اضطراب، بے چینی، اور بے یقینی کی اس فضا میں جو لوگ دنیائے اسلام کے کسی مستقل اور پائیدار اتحاد کی، جو لوگوں کی آرزوں اور امنگوں کا مظہر ہو، توقع رکھتے ہیں، وہ بہت بڑی خوش فہمی کا شکار ہیں۔

ان مسلمان ممالک کے علاوہ مشرق میں صرف دو طاقتیں ایسی رہ جاتی ہیں جن کے ہاتھ میں ایشیا کی قیادت آسکتی ہے۔ ان میں ایک چین ہے اور دوسری بھارت۔ چین کے امکانات سب سے زیادہ روشن تھے لیکن اب امریکہ بھارت کی جس طریقہ سے پشت پناہی کر رہا ہے اُس سے حالات بھارت کے حق میں پلٹ گئے ہیں اور خطرہ یہی ہے کہ اب چین کی بجائے بھارت مشرق کے لیے

دیوِ استبداد ثابت ہوگا۔

رُوس اور چین کے درمیان عقیدے اور مسلک کا اتحاد ہے اور اس وجہ سے چین اپنے اس حلیف پر اعتماد کر سکتا ہے۔ لیکن روس نے اس وقت اس ملک کے متعلق اپنی جو روش اختیار کی ہے اُسے دیکھ کر ذہن میں فطری طور پر بہت سے شکوک و شبہات پیدا ہو رہے ہیں۔ بھارت اور چین کے درمیان شدید اختلافات ہیں اور ان اختلافات کی وجہ سے اُن کے درمیان سرحُبول بھی ہو چکی ہے۔ لیکن روس ابھی تک بھارت کی دوستی کا اسی طرح دم بھر رہا ہے جس طرح کہ وہ ان اختلافات سے پہلے بھرتا تھا۔ اُس کے رویے میں قطعاً کوئی فرق نہیں آیا۔ نیتوں کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے۔ لیکن حالات کا مطالعہ یہ بتا رہا ہے کہ روس مشرقِ وسطیٰ میں اپنے استعماری عزائم کی تکمیل میں چین کی اُبھرتی ہوئی طاقت کو سدِ راہ سمجھتا ہے اور اس وجہ سے اس کی ترقی کو وہ پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ آغاز میں تو وہ اپنے چینی حلیف کے لیے ہر قسم کے ایثار پر آمادہ تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ چین اُس کے ایک وفادار ایجنٹ کی حیثیت سے مشرق میں اپنے آقا کے حق میں حالات کو سازگار بنانے کے لیے مخلصانہ کوشش کرے گا لیکن اُس پر جس وقت سے یہ راز منکشف ہوا ہے کہ چین خود اپنے بھی کچھ عزائم رکھتا ہے اور وہ ایشیا میں اپنی ہی قیادت اور سیادت قائم کرنے کا خواہاں ہے، اُس وقت سے روس کے رویے میں خاصی تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ روس کو یہ خطرہ بھی لاحق ہے کہ کہیں بھارت بالکل ہی امریکہ کی گود میں نہ چلا جائے اور اس سے طاقت کا توازن بگڑ جائے۔ یہ وجوہ اگر نہ ہوتے تو آج روس اور بھارت کے درمیان بھی اختلافات کی اتنی وسیع خلیج حائل ہو جاتی جتنی کہ چین اور بھارت کے درمیان ہے۔ لیکن ان دونوں ممالک کے درمیان تعلقات خاصے خوشگوار ہیں۔

پھر چین کے اندر اشتراکیت نے ارتقاء اور ترقی کی جو صورت اختیار کی ہے اُس سے بھی روس کچھ زیادہ خوش نہیں۔ وہ ہر قدم پر یہ محسوس کرتا ہے کہ چین اس کا تابعِ مہمل بننے کی بجائے اپنی انفرادیت

برقرار رکھنے پر مُصر ہے اور اپنے آپ کو کلّی طور پر اُس کی غلامی اختیار کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔ وہ کچھ اپنے الگ مقاصد اور اپنے مخصوص مفادات بھی رکھتا ہے اس لیے اشتراکیت کا علمبردار ہونے کے باوجود ان کے درمیان من و تُو کے سارے حجابات ابھی تک زائل نہیں ہوئے اور یہ حجابات کسی وقت بھی بیگانگی کی صورت اختیار کر سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ یورپ میں حالات نے جو نئی کروٹ لی ہے اُس نے روس کے اثر و نفوذ کے امکانات کو وہاں کافی حد تک روشن بنا دیا ہے۔ فرانس نے برطانیہ پر مشترک منڈی کی شرکت کے دروازے بند کر کے اس کو سیاسی اور معاشی اعتبار سے زبردست زک پہنچائی ہے۔ لیکن وہ ابھی اپنے آپ میں یہ سکت نہیں پاتا کہ خود اپنی طاقت کے بل بوتے پر یورپ کی زمام کار سنبھال سکے۔ وہ اس معاملے میں کسی زبردست ہاتھ کا محتاج ہے جو آڑے وقت میں اُس کے لیے مضبوط سہارا بن سکے۔ اس ضمن میں آخری چارۂ کار اشتراکی روس کی سرپرستی ہے۔ یہی وہ واحد طاقت ہے جو یورپ کی چھوٹی اور کمزور سلطنتوں کے اتحاد کو ایک مؤثر قوت بنا سکتی ہے اور امریکہ اور برطانیہ کی ریشہ دوانیوں سے نہایت کامیابی کے ساتھ نمٹ سکتی ہے۔ یورپ اگر برطانیہ اور امریکہ کے تسلّط سے آزاد ہو کر ایک نئے پیکر میں ڈھلنے کا عزم رکھتا ہے تو وہ روس کا دست نگر ہونے پر مجبور ہے۔ اس کی تائید اور حمایت کے بغیر اُس کا شیرازہ مجتمع نہیں ہو سکتا۔ خود روس کے لیے یورپ میں اثر و نفوذ کرنے کا یہ زریں موقع ہے جو بالکل بخت و اتفاق سے اس کے ہاتھ آ گیا ہے۔ وہ اسے غنیمت جانتے ہوئے اس سے پُورا پُورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کریگا۔

ان حالات میں جب کہ یورپین طاقتوں کی توجہ اپنے مسائل کے حل کرنے میں اُلجھی ہوئی ہو، جب مسلمان ممالک پر شدید اضمحلال طاری ہو رہا ہو اور اُن کی خدا داد صلاحیتیں ایک دوسرے کو گرانے میں صرف ہو رہی ہوں، امریکہ کی بھارت کو امداد مشرق کے لیے ایک زبردست خطرہ

ثابت ہو سکتی ہے۔ حالات کے تیور اس بات کی نشاندہی کر رہے ہیں کہ اینگلو امریکن بلاک بھارت سے نہ صرف چین کی بڑھتی ہوئی یلغار کو روکنے کا کام لینا چاہتا ہے بلکہ اس نے اپنی خارجہ پالیسی کو اب جس نہج پر ترتیب دیا ہے، اس کے پیشِ نظر وہ اپنے استعماری مفادات کی حفاظت و پاسبانی کے لیے بھی بھارت پر مکمل اعتماد کر سکتا ہے۔ اس مقصد کے لیے جس ملک پر اُس کی نگاہِ انتخاب شروع ہی سے اُٹھ رہی تھی وہ صرف بھارت ہی تھا لیکن اس کی غیر جانبداری کے دعووں کی وجہ سے اُسے اس پر بھروسہ کرنے میں کچھ تامل ہو رہا تھا۔ اب جبکہ بھارت نے اپنی وفاداری کا کھلے بندوں اعلان کر دیا ہے تو امریکہ کے لیے اس سے زیادہ خوشی کی کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ وہ اس ملک سے اپنے رشتے کو مضبوط کرنے کے لیے ہر قسم کی تدابیر اختیار کرے گا۔ جس موقع کے لیے وہ پندرہ سال سے برابر منتظر چلا آ رہا تھا۔ اُس کے حاصل ہو جانے کے بعد وہ اس سے یقیناً فائدہ اُٹھائے گا اور اس معاملے میں وہ کسی دوسرے ملک کے احساس کو راہ میں حائل نہ ہونے دیگا۔ بھارت کی دوستی اُسے سب سے زیادہ عزیز ہے اور اس کی رفاقت پر اُسے سب سے زیادہ اعتماد بلکہ ناز ہے اس لیے جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ کسی وقت ہمارے ساتھ بھی اُس کی راہ و رسم تھی، اور وہ اس کا پاس رکھتے ہوئے کوئی ایسا قدم نہ اُٹھائے گا جس سے ہمارے مفادات کو نقصان پہنچنے کا خدشہ ہو، وہ حقائق کی دنیا میں نہیں بلکہ خواب و خیال کی دنیا میں بستے ہیں اور اس کے طلسم سے جتنی جلدی وہ آزاد ہو جائیں اتنی ہی یہ چیز اُن کے اپنے حق میں اور ملک و ملت کے حق میں مفید ثابت ہوگی۔

اس سلسلے میں یہ بات ذہن نشین رہے کہ ہمیں اصل خطرہ امریکی امداد کا نہیں بلکہ اس کے غلط استعمال کا ہے۔ اگر ہمیں یہ یقین ہوتا کہ بھارت اِس امداد کو صرف اپنے ملکی استحکام میں استعمال کریگا تاکہ وہ چین کے جارحانہ حملوں کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر سکے تو ہمیں قطعاً کسی قسم کی تشویش لاحق نہ ہوتی۔ ہم خود اس بات کے دل سے آرزومند ہیں کہ ہر ملک بجائے خود اتنا مضبوط ہو جائے کہ وہ استعمار پرستوں کے باطل عزائم کو ناکام بنا سکے اور اپنی آزادی اور خودمختاری کی

اچھی طرح حفاظت کرسکے۔ سیاسی غلامی سے زیادہ دنیا میں کوئی بڑی لعنت نہیں اور آزادی سے زیادہ قابلِ قدر کوئی نعمت نہیں ہم جس طرح خود آزاد رہنا چاہتے ہیں اسی طرح دوسری قوموں کے لیے بھی یہ حق تسلیم کرتے ہیں۔ ہمارا یہ ایمان ہے کہ خالقِ کائنات نے انسانوں کو آزاد پیدا کیا ہے اس لیے بندوں کو قطعاً یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ انہیں اپنی بندگی پر مجبور کریں۔ یورپین اقوام نے گذشتہ دو صدیوں میں مشرق کی بے بس قوموں پر جس طرح دستِ ظلم دراز کیا ہے اُس کی تلخ یاد کبھی محو نہیں ہو سکتی۔ ہم ہر اُس قوم کے مددگار ہیں جو اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے جدوجہد کر رہی ہے اور اس سے ہر قسم کا تعاون کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

ہمیں اس امداد میں اصل خطرہ جو نظر آرہا ہے وہ یہ ہے کہ مال و متاع اور اسلحہ کی یہ بھاری مقدار مشرق کو کسی وقت بھی شعلۂ جوّالہ بنا سکتی ہے اور بھارت اس کی بدولت خود اپنے ہمسایہ ممالک کے لیے ایک بڑا استعماری خطرہ بن سکتا ہے جس کے اولین شکار مسلم ممالک ہی ہونگے آزادی کے بعد بھارت ملک کے اندر اور باہر جس نہج پر ترقی کر رہا ہے اُس نے ہمارے ان خدشات کو اور بھی بڑھا دیا ہے۔

اسے مشرق کی بدنصیبی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی سرزمین میں دوسرے ایشیائی ممالک کی طرح روایات کے بندھن بڑی سرعت کے ساتھ ٹوٹ رہے ہیں۔ اگر گاندھی جی آج زندہ ہوتے تو شاید وہ اس کی کچھ فکر کرتے۔ لیکن اس وقت اس ملک کی قیادت جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے اُن کے نزدیک مذہب اور اُس کی روایات محض جاہلیت کی یادگار ہیں جن سے قوم کو جلد از جلد نجات دلانا ہی اس کی حقیقی خیر خواہی ہے۔ پھر ہندو قوم چونکہ انگریزی اقتدار کے بالکل آغاز ہی سے مغربی اقدار حیات پر فریفتہ ہو چکی تھی اس لیے اس نے دھرم کی عزت و توقیر کے بلند بانگ دعووں کے باوجود کبھی بھی دھرم کو اپنی حیاتِ اجتماعی کی بنیاد اور اساس بنانے کا عزم نہیں کیا۔ اس کے نزدیک اس کی حیثیت ہمیشہ محض پوجا پاٹ کی رہی ہے اس سے آگے بڑھ کر وہ اپنی اخلاقی

قدریں کسی دھرم سے لینے کے بجائے سراسر مادیت اور قوم پرستی کے نظریات سے لیتی ہے۔

ہندو مذہب نے اس قوم کے اندر اپنی الگ قومی حیثیت کا احساس تو پیدا کر دیا ہے لیکن وہ اس کے مختلف طبقوں کے درمیان اتحاد اور اتفاق پیدا کرنے میں ناکام رہا ہے۔ چنانچہ اس قوم نے مغرب کی پیروی میں اپنے پریشان اجزا کے اندر ایک مقصدی ربط پیدا کرنے کے لیے ہمیشہ خاکِ وطن کی کشش سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ نیشنلزم کے دورِ عروج میں یہ نسخہ کافی مفید ثابت ہوا لیکن زمان و مکان کے سمٹ جانے کی وجہ سے جب جغرافیائی وحدتیں روز بروز کمزور ہوتی جا رہی ہیں، تو اب نیشنلزم کے اندر یہ تاثیر باقی نہیں رہی ہے کہ وہ اس قوم کے اندر فکر و نظر اور جذبہ و احساس کی ہم آہنگی پیدا کر کے اسے ایک وحدت بنا دے۔

ایک ایسا ملک جو نہایت ہی وسیع و عریض رقبے میں پھیلا ہوا ہو جس کے باشندوں میں رنگ و نسل، زبان اور تہذیب کے بے شمار امتیازات پائے جاتے ہوں اور ان امتیازات نے اُن کے درمیان منافرت بھی پیدا کر دی ہو، وہاں روایات کا ختم ہو جانا بڑا تشویشناک ہے۔ کیونکہ ان کے تماک و خون سے ہمیشہ جارحانہ قوم پرستی نے جنم لیا ہے۔ اس طرح کے منتشر اجزاء کو جوڑنے کے لیے اخلاق سے بے نیاز لیڈر ہمیشہ نفرت و عداوت، اور توسیعِ اقتدار کی ہوس سے کام لیتے رہے ہیں۔ اور اس کے نتائج پہلے دوسروں کے لیے، اور پھر خود ان کے لیے تباہ کن ثابت ہوئے ہیں۔

جرمنی کی تاریخ اس حقیقت پر پوری طرح گواہ ہے۔ مارٹن لوتھر کی تحریک اصلاحِ مذہب کے بعد جب لوگوں پر مذہبی روایات کی گرفت ڈھیلی ہوئی تو پھر انہیں باہم متحد رکھنے کے لیے ایک ایسی قوتِ قاہرہ کی ضرورت پیش آئی جو ان کے مائل بہ انتشار اجزا کے درمیان طاقت اور جبر کے زور سے اتحاد و اتفاق پیدا کر سکے۔

اس اندھی بہری قوت نے اہلِ جرمنی سے ہر اُس چیز کا مطالبہ کیا جس کا مذہب ایک

انسان سے عام طور پر تقاضا کرتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے ملک اور اس کے سربراہ کو کبریائی کے اُس بلند و بالا مقام پر فائز کر دیا جو صرف خالقِ کائنات کا حق ہے۔ چنانچہ جرمنی کی کتاب الایمان کا کلمۂ شہادت یہ قرار پایا:

"ہٹلر کی خدمت جرمنی کی خدمت ہے اور جرمنی کی خدمت خدا کی خدمت ہے"

پھر جارحانہ قوم پرستی کے جذبات اُبھارنے کے لیے یہ چیز بھی انتہائی ضروری تھی کہ عوام کے دماغ میں اس باطل خیال کی تخم ریزی کی جائے کہ حق اور صداقت صرف انہیں کی میراث ہے اور ہر وہ عقیدہ یا مسلک جس نے جرمنی کی سرزمین میں جنم نہیں لیا وہ سراسر غلط ہے۔ اس قوم پرستانہ ذہنیت اور غیر ملکی چیز کے خلاف عصبیت یہاں تک بڑھ گئی کہ اہلِ جرمنی نے کسی دوسرے ملک سے آئی ہوئی ان اعلیٰ قدروں کو بھی ماننے سے انکار کر دیا جنہیں خدا کے پاک بندوں نے وقتاً فوقتاً پیش کیا تھا اور جن میں کسی ایک قوم یا ملک کے مفاد کی حفاظت مقصود نہ تھی بلکہ پوری نوع انسانی کی فلاح مطلوب تھی۔ جرمن کے مشہور ماہر تعلیم پروفیسر اٹر کے یہ الفاظ اس تنگ نظری اور تعصب کی پورے طور پر غمازی کرتے ہیں:

"ہمارے بچے کیوں ایک غیر قوم کی تاریخ پڑھیں، انہیں کیوں ابراہیم اور اسحاق کے قصے سنائے جائیں۔ ہمارا خدا جرمنی ہونا چاہیے"

اس کے علاوہ لوگوں کے اندر نخوت اور تکبر کے جذبات کی آبیاری کر کے ایک غلط قسم کا احساس عظمت ان میں پیدا کرنے کی مذموم کوشش کی گئی تاکہ جرمنی کے باشندے اپنے آپ کو دوسرے سے بالاتر سمجھ کر اُن کے ساتھ کبھی انسانوں کا سا برتاؤ کرنے پر آمادہ نہ ہونے پائیں۔ ان کے ذہن میں یہ باطل خیال ایک سوچے سمجھے منصوبے کے ساتھ بٹھایا گیا کہ وہ جس نسل سے تعلق رکھتے ہیں وہ دنیا کی بہترین نسل ہے اور علوم و آداب، فنی کمالات اور نوادرات کا جو بیش قیمت سرمایہ دنیا میں موجود ہے وہ سب انہیں کی ذہنی کاوشوں کا رہین منت ہے۔

اہلِ جرمنی کے اندر جوشِ عمل پیدا کرنے اور اُن کی قوتوں کو ایک راہ پر لگانے کے لیے بھی مثبت داعیات سے قطعاً کوئی فائدہ نہ اٹھایا گیا بلکہ قوم کے دل و دماغ میں نفرت اور خوف کے جذبات پیدا کیے گئے تاکہ وہ دیوانی ہو کر اپنے سربراہوں کے اشاروں پر کٹ مرنے کے لیے تیار ہو جائے اور نتائج اور عواقب سے یکسر آنکھیں بند کر لے۔

ان باطل افکار و نظریات اور ان غلط احساسات و جذبات کا جو نتیجہ نکلا وہ سب کے سامنے ہے۔ ایک قوم جو کبھی عظیم الشان روایات کی حامل تھی، جس نے علم کی ترقی اور تہذیب و تمدن کی تشکیل میں بیش بہا خدمات سر انجام دی تھیں۔ اُس پر یکایک جارحانہ قوم پرستی کا جنون سوار ہو گیا اور اُس نے اپنی عقلی اور فکری قوتوں کو تپاک کر، ایک ایسی مہم کا آغاز کیا جس نے پوری دنیا کو برباد کر کے رکھ دیا اور آخر کار خود اس کی کامل شکست پر منتج ہوئی۔

ہندوستان میں حالات کی موجودہ رفتار اسی جارحانہ قوم پرستی کے خطرہ کی طرف واضح اشارہ کر رہی ہے۔ خاکِ وطن سے محبت میں غلو اور اس کی تقدیس و تکریم میں مبالغہ آمیزی کے ذریعہ بھارت کو کبریائی کے اُسی مقام پر لانے کی کوششیں ہو رہی ہیں جس پر کہ اہلِ جرمنی نے ان یہ کو فائز کیا تھا۔ پھر لوگوں کے اندر مصنوعی خوف و ہراس پیدا کرنے اور دوسری قوموں کے خلاف نفرت اور حقارت کے جذبات اُبھارنے کے لیے تمام وہ حربے استعمال کیے جا رہے ہیں جو جارحانہ قوم پرستی کی علمبردار قومیں بالعموم استعمال کرتی ہیں۔ روایات کے بندھن ٹوٹنے کی وجہ سے ملک کے اندر جس قسم کا انتشار پیدا ہو رہا ہے اس سے آمریت کے حق میں فضا خود بخود سازگار ہوتی چلی جا رہی ہے۔ چنانچہ اب اقتدار سمٹ کر ایک ایسے گروہ کے ہاتھ میں منتقل ہو رہا ہے جو انتہائی متعصب اور تنگ نظر ہے اور اپنے سوا ملک کے اندر اور باہر کسی وجود کو گوارا نہیں کر سکتا۔ اور ان سب سے بڑھ کر اس ملک میں نسلی تفوق کا شیطانی فلسفہ، جو جارحانہ قوم پرستی کی جان ہے، ہندوؤں کے با اثر حلقوں میں بڑی تیزی کے ساتھ

سرایت کر رہا ہے مسٹر جسٹس ایس ایس دھاون، جو الہ آباد ہائی کورٹ کے ایک ممتاز رکن ہیں، انہوں نے اپنی ایک تقریر میں اس کی طرف نہایت واضح الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔ انہوں نے الہ آباد یونیورسٹی کے فلسفے کے طلباء کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"ایک عظیم قوم اچھے نظم و نسق کے ساتھ جس کی کابینہ میں اوسط ذہن کے ایسے انسان ہوں جن کے پاس فلسفہ اخلاق ہو، اپنے مقصود کو پا سکتی ہے لیکن ایسے قابل حکمرانوں کے ساتھ جن کے پاس شیطانی فلسفہ ہو قوم کو تباہی و بربادی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔"

"مضبوط فلسفۂ اخلاق کے بغیر فولاد کے کارخانے ملک کو نہیں بنا سکتے۔ ہٹلر کے جرمنی نے صنعت کاری میں یورپ کو مات کر دیا تھا اور ہٹلر اپنی نجی زندگی میں ایماندار اور قابل آدمی بھی تھا لیکن اس نے اپنے شیطانی فلسفے "نسلِ برتر" کی وجہ سے بنی نوع انسان کو تباہی میں مبتلا کر دیا۔ ہٹلر کے فلسفہ کی ایک کروڑ ایشیائی، یورپی، اور امریکیوں اور ساٹھ لاکھ یہودیوں کی لاشیں گواہ ہیں"

"علی گڑھ اور میرٹھ میں جو فسادات ہوئے ہیں ان سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس ہولناک سماجی فلسفہ کے جراثیم ہم میں نفوذ کر گئے ہیں اور اگر ان کا قلع قمع نہ کیا گیا تو ہندوستان میں جنوبی افریقہ کی ریاست، بلکہ ہٹلر کے جرمنی سے زیادہ حالات خراب ہو جائیں گے۔"

ان حالات میں جب انسانوں کا کوئی گروہ جارحانہ قوم پرستی کے نشہ میں بدمست ہو کر آگے بڑھ رہا ہو، اُس کے ہاتھ میں غیر معمولی طاقت کا آجانا، اُس کے اپنے حق میں بھی اور پوری انسانیت کے حق میں بھی سخت خطرناک ہوتا ہے۔ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے کہ اگر ہمسایہ ممالک کسی تشویش کا اظہار کریں تو یہ بالکل فطری امر ہے۔ پاکستان کو امریکہ سے یہ گلہ نہیں کہ اس نے بھارت کو مضبوط بنانے میں مدد دی ہے بلکہ اُسے اصل شکایت یہ ہے کہ وہ محض اپنے مفاد کی خاطر آس پاس کی دوسری قوموں کے

مفادات سے یکسر بے پروا ہو کر بھارت کو اس قدر زیادہ طاقت فراہم کر رہا ہے جو دوسرے ممالک کے لیے سخت خطرہ کا موجب بن سکتی ہے۔ بھارت میں جارحانہ قوم پرستی کا جنون جس تشویشناک رفتار سے بڑھ رہا ہے اس کا ہلکا سا اندازہ اُن فسادات سے کیا جا سکتا ہے جو گذشتہ پندرہ برسوں میں وہاں مسلسل ہوتے رہے ہیں۔ اور ان میں ملک کی سب سے بڑی اقلیت (مسلمان) کے ساتھ جو انسانیت سوز سلوک کیا گیا ہے وہ اپنی ہولناکیوں کے اعتبار سے اُس سلوک سے کسی طرح بھی مختلف نہیں جو جرمنی میں ہٹلر نے یہودیوں کے ساتھ کیا تھا کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ بھارت کے وہ سربراہ جو خود برطانیہ کے ظلم و ستم سے ابھی ابھی بچ کر نکلے تھے۔ اور جنہیں قدرت نے مظلوموں کی حفاظت اور پاسبانی کا مقدس فرض سونپا تھا وہ خونریزی، سفاکی اور زیردست آزاری کے دیوتا ثابت ہوئے اس قسم کے متعصب اور جارحانہ عزائم رکھنے والے گروہ سے یہ امید کیسے رکھی جا سکتی ہے کہ جب اس کی طاقت میں بے پناہ اضافہ ہوگا تو وہ دوسری قوموں کو تباہ و برباد کرنے میں کسی قسم کا دریغ کریگا۔

اسوقت جبکہ یہ سطور لکھی جا رہی ہیں مسئلہ کشمیر کے حل کرنے کے لیے پاکستان اور ہندوستان کے درمیان مذاکرات پانچویں دور میں داخل ہو رہے ہیں انسانیت کا ہر بہی خواہ اس بات کا دل و جان سے آرزو مند ہے کہ اس مسئلہ کا کوئی منصفانہ اور با عزت حل نکل آئے۔ اس سلسلے میں ہم بھارت کو پھر ایک بار اس امر کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ وہ کشمیر کے بارے میں اپنی چالبازیوں پر نازاں ہونے کی بجائے اپنے موقف کے اخلاقی پہلوؤں پر غور کرے اُس کے سربراہوں نے تاریخ میں اُن سیاہ قوموں کی تصویریں یقیناً دیکھی ہونگی جنہوں نے اپنی ناانصافیوں کی وجہ سے اس کرۂ ارضی کو جہنم بنا دیا اور اِن کے مقابلے میں ان خوش نصیب لوگوں کے چہروں پر بھی نگاہ ڈالنے کا موقع ملا ہوگا جنہوں نے انسانوں کے درمیان عدل و انصاف قائم کرنے کی کوشش کی۔ بھارت کیلئے یہ ایک فیصلہ کن مرحلہ ہے کہ وہ اب اپنی قومی تصویر آویزاں کرنے کے لیے کس گیلری کو منتخب کرتا ہے۔

اس وقت اگر اس نے طاقت کے نشے میں ظالم اور سفاک قوموں میں اپنی جگہ کا انتخاب کیا

تو یہ ایک ایسا شرمناک فیصلہ ہوگا جس پر اس کی آئندہ نسلیں کبھی بھی ندامت کے مارے سر نہ اٹھا سکیں گی۔

بے جا نہ ہوگا کہ ایک بات ہم اس نازک مرحلہ پر اپنے بھائی بندوں کی خدمت میں بھی عرض کر دیں۔ سیاست میں بلاشبہ حتمیت اور قطعیت نہیں ہوتی اور اس کے نقشے میں ہر وقت تبدیلی کا امکان موجود رہتا ہے لیکن انہیں اس چیز کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ ایک با اصول سیاست دان کے ذہن میں ایک ایسا بنیادی خاکہ بہرحال ضرور ہوتا ہے جس میں وہ کسی قسم کا تغیر و تبدل کرنا گوارا نہیں کر سکتا۔ براہ کرم مسئلہ کشمیر کو حل کرتے وقت اس اصول کو کسی منزل پر بھی نظر انداز نہ کیجیے۔ گذشتہ پندرہ سالوں میں ہم پوری دنیا کو یہ باور کراتے رہے ہیں کہ کشمیر کو نہ ہم خود قوت کے زور سے اپنے ساتھ شامل کرنا چاہتے ہیں اور نہ یہ حق ہندوستان کو دیتے ہیں بلکہ اس امر کا فیصلہ کہ یہ خطہ ہمارے ساتھ الحاق کرے یا بھارت کے ساتھ، سراسر کشمیری عوام کی مرضی پر موقوف ہے۔ یہی ایک موقف ہے جس کی تائید عدل و انصاف اور اخلاق سے ہوتی ہے اور ہم اس معاملے میں پوری انسانیت کے ضمیر کو اپیل کر سکتے ہیں۔ اب اس وقت ہم اگر اپنے اس اخلاقی موقف کو چھوڑ کر کشمیر کی تقسیم پر رضامند ہو جائیں تو دنیا میں آخر ہماری کیا وقعت باقی رہ جائیگی۔ کیا لوگ پھر یہ سمجھنے میں حق بجانب نہ ہونگے کہ ہمارا یہ موقف بالکل ڈھونگ تھا جسے ہم نے محض دنیا کو دھوکہ دینے کے لیے رچا رکھا تھا۔ کشمیر کی تقسیم اگر اصولاً صحیح اور درست ہے تو پھر چند میلوں کے رقبے کا قضیہ کوئی ایسا قضیہ نہیں جس کے لیے اتنی ہٹ دھرمی دکھائی جائے۔ اس کے علاوہ یہ بھی سوچیے کہ کشمیری عوام پر ہمارے اس بے اصولے پن کا کیا ردِ عمل ہوگا۔ کیا ہماری اس حرکت سے اُن کے دل و دماغ میں یہ خیال جاگزیں نہ ہوگا کہ اہل کشمیر کی حیثیت ایک قوم کی نہیں بلکہ بے زبان بھیڑ بکریوں کی سی ہے جن کا پاکستان اور بھارت جس طرح چاہیں سودا چکا سکتے ہیں۔

پھر ہم یہ بات بھی سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آخر اس وقت ہم مسئلہ کشمیر کے حل کرنے پر کیوں اتنے مُصر ہیں بھارت اگر اپنے ملک کی سیاسی صورت حال کے پیش نظر اسے حل کرنے کے لیے مضطرب ہے۔ تو اس کی بہر حال ایک وجہ سمجھی جا سکتی ہے۔ پاکستان اس معاملے میں جس بے تابی کا اظہار کر رہا ہے اُس کی مصلحتیں ہماری نظروں سے اوجھل ہیں۔

تفہیم القرآن

الصّافّات

نام پہلی ہی آیت کے لفظ والصّافّات سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول مضامین اور طرزِ کلام سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ سورت غالباً مکی دور کے وسط میں، بلکہ شاید اس دورِ متوسط کے بھی آخری زمانہ میں نازل ہوئی ہے۔ اندازِ بیان صاف بتا رہا ہے کہ پس منظر میں مخالفت پوری شدت کے ساتھ برپا ہے اور نبیؐ و اصحابِ نبی کو نہایت دل شکن حالات سے سابقہ درپیش ہے۔

موضوع و مضمون اُس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ توحید و آخرت کا جواب جس تمسخر اور استہزاء کے ساتھ دیا جا رہا تھا، اور آپ کے دعوائے رسالت کو تسلیم کرنے سے جس شدت کے ساتھ انکار کیا جا رہا تھا، اُس پر کفارِ مکہ کو نہایت پُرزور طریقے سے تنبیہ کی گئی ہے اور آخر میں انہیں صاف صاف خبردار کر دیا گیا ہے کہ عنقریب یہی پیغمبر، جس کا تم مذاق اڑا رہے ہو، تمہارے دیکھتے دیکھتے تم پر غالب آجائے گا، اور تم اللہ کے لشکر کو خود اپنے گھر کے صحن میں اترا ہوا پاؤ گے (آیات نمبر ۱۷۱ تا ۱۷۹) یہ نوٹس اُس زمانے میں دیا گیا تھا جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی کے آثار دور دور کہیں نظر نہ آتے تھے۔ مسلمان (جن کو ان آیات میں اللہ کا لشکر کہا گیا ہے) بُری طرح ظلم و ستم کا نشانہ بن رہے تھے۔ ان کی تین چوتھائی تعداد ملک چھوڑ کر نکل گئی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مشکل ۴۰ - ۵۰ صحابہ مکہ میں رہ گئے تھے اور انتہائی بے بسی کے ساتھ ہر طرح کی زیادتیاں برداشت کر رہے تھے۔ اِن حالات میں ظاہر اسباب کو

دیکھتے ہوئے کوئی شخص یہ باور نہ کرسکتا تھا کہ غلبہ آخرکار محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی مٹھی بھر بے سروسامان جماعت کو نصیب ہو گا۔ بلکہ دیکھنے والے تو یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ تحریک مکے کی گھاٹیوں ہی میں دفن ہو کر رہ جائے گی۔ لیکن ۱۵-۱۶ سال سے زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ فتح مکہ کے موقع پر ٹھیک وہی کچھ پیش آگیا جس سے کفار کو خبردار کیا گیا تھا۔

تنبیہ کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس سورہ میں تفہیم اور ترغیب کا حق بھی پورے توازن کے ساتھ ادا فرمایا ہے۔ توحید اور آخرت کے عقیدے کی صحت پر مختصر اور دلنشین دلائل دیئے ہیں، مشرکین کے عقائد پر تنقید کرکے بتایا ہے کہ وہ کیسی لغو باتوں پر ایمان لائے بیٹھے ہیں۔ ان گمراہیوں کے بُرے نتائج سے آگاہ کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ ایمان و عمل صالح کے نتائج کس قدر شاندار ہیں۔ پھر اسی سلسلے میں پچھلی تاریخ کی مثالیں دی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے انبیاء کے ساتھ اور ان کی قوموں کے ساتھ کیا معاملہ رہا ہے، کس کس طرح اس نے اپنے وفادار بندوں کو نوازا ہے اور کس طرح ان کے جھٹلانے والوں کو سزا دی ہے۔

جو تاریخی قصے اس سورہ میں بیان کیے گئے ہیں ان میں سب سے زیادہ سبق آموز حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیاتِ طیبہ کا یہ اہم واقعہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ایک اشارہ پاتے ہی اپنے اکلوتے بیٹے کو قربان کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ اس میں صرف اُن کفارِ قریش ہی کے لیے سبق نہ تھا جو حضرت ابراہیم کے ساتھ اپنے نسبی تعلق پر فخر کرتے پھرتے تھے، بلکہ اُن مسلمانوں کے لیے بھی سبق تھا جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے تھے۔ یہ واقعہ سُنا کر انہیں بتا دیا گیا کہ اسلام کی حقیقت اور اس کی اصلی روح کیا ہے، اور اُسے اپنا دین بنا لینے کے بعد ایک مومنِ صادق کو کس طرح اللہ کی رضا پر اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔

سورہ کی آخری آیات محض کفار کے لیے تنبیہ ہی نہ تھیں بلکہ اُن اہلِ ایمان کے لیے بشارت بھی تھیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید و حمایت میں انتہائی حوصلہ شکن حالات کا مقابلہ کر رہے تھے۔ انہیں یہ آیات سنا کر خوشخبری دے دی گئی کہ آغاز کار میں جن مصائب سے انہیں سابقہ پیش آ رہا ہے اُن پر گھبرائیں نہیں، آخر کار غلبہ انہی کو نصیب ہوگا، اور باطل کے وہ علمبردار جو اس وقت غالب نظر آ رہے ہیں، انہی کے ہاتھوں مغلوب و مفتوح ہو کر رہیں گے۔ چند ہی سال بعد واقعات نے بتا دیا کہ یہ محض خالی خولی تسلی نہ تھی بلکہ ایک ہونے والا واقعہ تھا جس کی پیشگی خبر دے کر ان کے دل مضبوط کیے گئے تھے۔

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے

قطار در قطار صف باندھنے والوں کی قسم، پھر اُن کی قسم جو ڈانٹنے پھٹکارنے والے ہیں، پھر اُن کی قسم جو کلام نصیحت سنانے والے ہیں[1]، تمہارا معبودِ حقیقی بس ایک ہی ہے[2] ــــ وہ جو زمین

---

[1] مفسرین کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ ان تینوں گروہوں سے مراد فرشتوں کے گروہ ہیں۔ اور یہی تفسیر حضرات عبداللہ بن مسعود، ابن عباس، قتادہ، مسروق، سعید بن جُبیر، عکرمہ، مجاہد، سُدّی، ابن زید، اور ربیع بن انس سے منقول ہے۔ بعض مفسرین نے اس کی دوسری تفسیریں بھی کی ہیں، مگر موقع و محل سے یہی تفسیر زیادہ مناسبت رکھتی نظر آتی ہے۔

اس میں "قطار در قطار صف باندھنے" کا اشارہ اس طرف ہے کہ تمام فرشتے جو نظامِ کائنات کی تدبیر کر رہے ہیں، اللہ کے بندے اور غلام ہیں، اس کی اطاعت و بندگی میں صف بستہ ہیں اور اس کے فرامین کی تعمیل کے لیے ہر وقت مستعد ہیں۔ اس مضمون کا اعادہ آگے چل کر پھر آیت ۱۶۵ میں کیا گیا ہے جس میں فرشتے خود اپنے متعلق کہتے ہیں وَاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ

"ڈانٹنے اور پھٹکارنے" سے مراد، جیسا کہ بعض مفسرین نے سمجھا ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ فرشتے ہیں جو بادلوں کو ہانکتے اور بارش کا انتظام کرتے ہیں۔ لیکن آگے کے مضمون سے جو مفہوم زیادہ مناسبت رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ انہی فرشتوں میں سے ایک گروہ وہ بھی ہے جو نافرمانوں اور مجرموں کو پھٹکارتا ہے اور اس کی یہ پھٹکار محض لفظی ہی نہیں ہوتی بلکہ

اور آسمانوں کا اور تمام اُن چیزوں کا مالک ہے جو زمین و آسمان میں ہیں، اور سارے مشرقوں[۳] کا مالک[۴]۔

انسانوں پر وہ حوادثِ طبیعی اور آفاتِ تاریخی کی شکل میں برستی ہے۔

"کلامِ نصیحت سنانے" سے مراد یہ ہے کہ انہی فرشتوں میں وہ بھی ہیں جو امرِ حق کی طرف توجہ دلانے کے لیے تذکیر کی خدمت انجام دیتے ہیں، حوادثِ زمانہ کی شکل میں بھی جن سے عبرت حاصل کرنے والے عبرت حاصل کرتے ہیں اور اُن تعلیمات کی صورت میں بھی جو اُن کے ذریعہ سے انبیاء پر نازل ہوتی ہیں، اور اُن الہامات کی صورت میں بھی جو اُن کے واسطے سے نیک انسانوں پر ہوتے ہیں۔

۲؎ یہ وہ حقیقت ہے جس پر مذکورہ صفات کے حامل فرشتوں کی قسم کھائی گئی ہے۔ گویا دوسرے الفاظ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ یہ پورا نظامِ کائنات جو اللہ کی بندگی میں چل رہا ہے، اور اس کائنات کے وہ سارے مظاہر جو اللہ کی بندگی سے انحراف کرنے کے بُرے نتائج انسانوں کے سامنے لاتے ہیں، اور اس کائنات کے اندر یہ انتظام کہ ابتدائے آفرینش سے آج تک پے در پے ایک ہی حقیقت کی یاددہانی مختلف طریقوں سے کرائی جا رہی ہے، یہ سب چیزیں اس بات پر گواہ ہیں کہ انسانوں کا "الٰہ" صرف ایک ہی ہے۔

"الٰہ" کے لفظ کا اطلاق دو معنوں پر ہوتا ہے۔ ایک وہ معبود جس کی بالفعل بندگی و عبادت کی جا رہی ہو۔ دوسرے وہ معبود جو فی الحقیقت اس کا مستحق ہو کہ اس کی بندگی و عبادت کی جائے۔ یہاں الٰہ کا لفظ دوسرے معنی میں استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ پہلے معنی میں تو انسانوں نے دوسرے بہت سے الٰہ بنا رکھے ہیں۔ اسی بنا پر ہم نے "الٰہ" کا ترجمہ "معبودِ حقیقی" کیا ہے۔

۳؎ سورج ہمیشہ ایک ہی مطلع سے نہیں نکلتا بلکہ ہر روز ایک نئے زاویے سے طلوع ہوتا ہے۔ نیز ساری زمین پر وہ بیک وقت طالع نہیں ہو جاتا بلکہ زمین کے مختلف حصّوں پر مختلف اوقات میں اس کا طلوع ہوا کرتا ہے۔ ان وجوہ سے مشرق کے بجائے مشارق کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اور اس کے ساتھ مغارب کا ذکر نہیں کیا گیا، کیونکہ مشارق کا لفظ خود ہی مغارب پر دلالت کرتا ہے۔ تاہم ایک جگہ رب المشارق والمغارب کے الفاظ بھی آئے ہیں (المعارج ۴۰)۔

۴؎ ان آیات میں جو حقیقت ذہن نشین کرائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ کائنات کا مالک و فرمانروا ہی انسانوں کا اصل معبود ہے، اور وہی درحقیقت معبود ہو سکتا ہے، اور اسی کو معبود ہونا چاہیے۔ یہ بات سراسر عقل کے خلاف ہے

ہم نے آسمانِ دنیا[۵] کو تاروں کی زینت سے آراستہ کیا ہے اور ہر شیطانِ سرکش سے اس کو محفوظ کر دیا ہے[۶]۔ یہ شیاطین ملاءِ اعلیٰ کی باتیں نہیں سن سکتے، ہر طرف سے مارے اور ہانکے جاتے ہیں اور ان کے لیے پیہم عذاب[۷]

کہ رب (یعنی مالک اور حاکم اور مربّی و پروردگار) کوئی ہو اور الٰہ (عبادت کا مستحق) کوئی اور ہو جائے۔ عبادت کی بنیادی وجہ ہی یہ ہے کہ آدمی کا نفع و ضرر، اس کی حاجتوں اور ضرورتوں کا پورا ہونا، اس کی قسمت کا بننا اور بگڑنا، بلکہ بجائے خود اس کا وجود و بقا ہی جس کے اختیار میں ہے، اس کی بالاتری تسلیم کرنا اور اس کے آگے جھکنا آدمی کی فطرت کا عین تقاضا ہے۔ اس وجہ کو آدمی سمجھ لے تو خود بخود اس کی سمجھ میں یہ بات آجاتی ہے کہ اختیارات والے کی عبادت نہ کرنا اور بے اختیار کی عبادت کرنا، دونوں صریح خلافِ عقل و فطرت ہیں۔ عبادت کا استحقاق پہنچتا ہی اس کو ہے جو اقتدار رکھتا ہے۔ رہیں بے اقتدار ہستیاں تو وہ نہ اس کی مستحق ہیں کہ ان کی عبادت کی جائے، اور نہ ان کی عبادت کرنے اور ان سے دعائیں مانگنے کا کچھ حاصل ہے، کیونکہ ہماری کسی درخواست پر کوئی کارروائی کرنا سرے سے ان کے اختیار میں ہے ہی نہیں۔ ان کے آگے عاجزی و نیازمندی کے ساتھ جھکنا اور ان سے دعا مانگنا بالکل ویسا ہی احمقانہ فعل ہے جیسے کوئی شخص کسی حاکم کے سامنے جائے اور اس کے حضور درخواست پیش کرنے کے بجائے جو دوسرے سائلین وہاں درخواستیں لیے کھڑے ہوں انہی میں سے کسی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جائے۔

۵ آسمانِ دنیا سے مراد قریب کا آسمان ہے، جس کا مشاہدہ کسی دوربین کی مدد کے بغیر ہم برہنہ آنکھ سے کرتے ہیں۔ اس کے آگے جو عالم مختلف طاقتوں کی دوربینوں سے نظر آتے ہیں، اور جن عالموں تک ابھی ہمارے وسائلِ مشاہدہ کی رسائی نہیں ہوئی ہے، وہ سب دور کے آسمان ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ سماء کسی متعین چیز کا نام نہیں ہے بلکہ قدیم ترین زمانے سے آج تک انسان بالعموم یہ لفظ اور اس کے ہم معنی الفاظ عالمِ بالا کے لیے استعمال کرتا چلا آ رہا ہے۔

۶ یعنی یہ عالمِ بالا محض خلا ہی نہیں ہے کہ جس کا جی چاہے اس میں نفوذ کر جائے، بلکہ اس کی بندش ایسی مضبوط ہے، اور اس کے مختلف خطے ایسی مستحکم سرحدوں سے محصور کیے گئے ہیں کہ کسی شیطانِ سرکش کا ان حدوں سے گزرنا ممکن نہیں ہے۔ کائنات کے ہر تارے اور سیارے کا اپنا ایک دائرہ اور کرہ (SPHERE) ہے جس کے اندر سے کسی کا نکلنا بھی سخت دشوار ہے اور جس میں باہر سے کسی کا داخل ہونا بھی آسان نہیں ہے۔ ظاہری آنکھ سے کوئی دیکھے تو خلائے محض کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ لیکن

ہے۔ تاہم اگر کوئی ان میں سے کچھ لے اُڑے تو ایک تیز شعلہ اس کا پیچھا کرتا ہے ۔ ؀

حقیقت میں اس خلا کے اندر بے حد و حساب خطے ایسی مضبوط سرحدوں سے محفوظ کیے گئے ہیں جن کے مقابلے میں آہنی دیواروں کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس کا کچھ اندازہ ان گوناگوں مشکلات سے کیا جا سکتا ہے جو زمین کے رہنے والے انسان کو اپنے قریب ترین ہمسائے، چاند تک پہنچنے میں پیش آ رہی ہیں۔ ایسی ہی مشکلات زمین کی دوسری مخلوق، یعنی جنوں کے لیے بھی عالمِ بالا کی طرف صعود کرنے میں مانع ہیں۔

؀ اس مضمون کو سمجھنے کے لیے یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ اُس وقت عرب میں کہانت کا بڑا چرچا تھا جگہ جگہ کاہن بیٹھے پیشین گوئیاں کر رہے تھے، غیب کی خبریں دے رہے تھے، گم شدہ چیزوں کے پتے بتا رہے تھے، اور لوگ اپنے اگلے پچھلے حال دریافت کرنے کے لیے ان سے رجوع کر رہے تھے۔ ان کاہنوں کا دعویٰ یہ تھا کہ جن اور شیاطین ان کے قبضے میں ہیں اور وہ انہیں ہر طرح کی خبریں لا لا کر دیتے ہیں۔ اس ماحول میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منصبِ نبوت پر سرفراز ہوئے اور آپ نے قرآن مجید کی آیات سنانی شروع کیں جن میں پچھلی تاریخ اور آئندہ پیش آنے والے حالات کی خبریں دی گئی تھیں، اور ساتھ ساتھ آپ نے یہ بھی بتایا کہ ایک فرشتہ یہ آیات میرے پاس لاتا ہے، تو آپ کے مخالفین نے فوراً آپ کے اوپر کاہن کی پھبتی کس دی اور لوگوں سے کہنا شروع کر دیا کہ ان کا تعلق بھی دوسرے کاہنوں کی طرح کسی شیطان سے ہے جو عالمِ بالا سے کچھ سُن گُن لے کر ان کے پاس آ جاتا ہے اور یہ اُسے وحیِ الٰہی بنا کر پیش کر دیتے ہیں۔ اس الزام کے جواب میں اللہ تعالیٰ یہ حقیقت ارشاد فرما رہا ہے کہ شیاطین کی تو رسائی ہی عالمِ بالا تک نہیں ہو سکتی۔ وہ اِس پر قادر نہیں ہیں کہ ملاءِ اعلیٰ (یعنی گروہِ ملائکہ) کی باتیں سن سکیں اور لا کر کسی کو خبریں دے سکیں۔ اور اگر اتفاقاً کوئی ذرا سی بھنک کسی شیطان کے کان میں پڑ جاتی ہے تو قبل اس کے کہ وہ اسے لے کر نیچے آئے، ایک تیز شعلہ اس کا تعاقب کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ملائکہ کے ذریعہ سے کائنات کا جو عظیم الشان نظام چل رہا ہے وہ شیاطین کی دراندازی سے پوری طرح محفوظ ہے۔ اُس میں دخل دینا تو درکنار، اس کی معلومات حاصل کرنا بھی ان کے بس میں نہیں ہے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، صفحہ ۵۰۰ تا ۵۰۲)

اب اِن سے پوچھو، اِن کی پیدائش زیادہ مشکل ہے یا اُن چیزوں کی جو ہم نے پیدا کر رکھی ہیں؟ اِن کو تو ہم نے لیس دار گارے سے پیدا کیا ہے۔ تم (اللہ کی قدرت کے کرشموں پر) حیران ہو اور

ش۸ یہ کفارِ مکہ کے اُس شبہ کا جواب ہے جو وہ آخرت کے بارے میں پیش کرتے تھے۔ اُن کا خیال یہ تھا کہ آخرت ممکن نہیں ہے، کیونکہ مرے ہوئے انسانوں کا دوبارہ پیدا ہونا محال ہے۔ اس کے جواب میں امکانِ آخرت کے دلائل پیش کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سب سے پہلے اُن کے سامنے یہ سوال رکھتا ہے کہ اگر تمہارے نزدیک مرے ہوئے انسانوں کو دوبارہ پیدا کرنا بڑا سخت کام ہے جس کی قدرت تمہارے خیال میں ہم کو حاصل نہیں ہے تو بتاؤ کہ یہ زمین و آسمان، اور یہ بے شمار اشیاء جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، ان کا پیدا کرنا کوئی آسان کام ہے؟ آخر تمہاری عقل کہاں ماری گئی ہے کہ جس خدا کے لیے یہ عظیم کائنات پیدا کرنا مشکل نہ تھا، اور جو خود تم کو ایک دفعہ پیدا کر چکا ہے، اس کے متعلق تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہاری دوبارہ تخلیق سے وہ عاجز ہے۔

ش۹ یعنی یہ انسان کوئی بڑی چیز تو نہیں ہے۔ مٹی سے بنایا گیا ہے اور پھر اسی مٹی سے بنایا جا سکتا ہے۔ لیس دار گارے سے انسان کی پیدائش کا مطلب یہ بھی ہے کہ انسانِ اول کی پیدائش مٹی سے ہوئی تھی اور پھر آگے نسلِ انسانی اسی پہلے انسان کے نطفے سے وجود میں آئی۔ اور یہ بھی ہے کہ ہر انسان لیس دار گارے سے بنا ہے۔ اس لیے کہ انسان کا سارا مادۂ وجود زمین ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ جس نطفے سے وہ پیدا ہوا ہے وہ غذا سے بنتا ہے، اور استقرارِ حمل کے وقت سے مرتے دم تک اس کی پوری ہستی جن اجزا سے مرکب ہوتی ہے وہ سب بھی غذا ہی سے فراہم ہوتے ہیں۔ یہ غذا خواہ حیوانی ہو یا نباتی، آخرکار اس کا ماخذ وہ مٹی ہے جو پانی کے ساتھ مل کر اس قابل ہوتی ہے کہ انسان کی خوراک کے لیے غلے اور ترکاریاں اور پھل نکالے، اور اُن حیوانات کو پرورش کرے جن کا دودھ اور گوشت انسان کھاتا ہے۔ پس بنائے استدلال یہ ہے کہ یہ مٹی اگر حیات قبول کرنے کے لائق نہ تھی تو تم آج کیسے زندہ موجود ہو؟ اور اگر اس میں زندگی پیدا کیے جانے کا آج امکان ہے، جیسا کہ تمہارا موجود ہونا خود اس کے امکان کو صریح طور پر ثابت کر رہا ہے، تو کل دوبارہ اسی مٹی سے تمہاری پیدائش کیوں ممکن نہ ہو گی؟

یہ اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ سمجھایا جاتا ہے تو سمجھ کر نہیں دیتے۔ کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو اسے ٹھٹھوں میں اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں "یہ تو صریح جادو ہے[10]، بھلا کہیں ایسا ہو سکتا ہے کہ جب ہم مر چکے ہوں اور مٹی بن جائیں اور ہڈیوں کا پنجر رہ جائیں اُس وقت ہم پھر زندہ کر کے اٹھا کھڑے کیے جائیں؟ اور کیا ہمارے اگلے وقتوں کے آباء اجداد بھی اٹھائے جائیں گے؟" ان سے کہو ہاں اور تم (خدا کے مقابلے میں) بے بس ہو[11]۔

بس ایک ہی جھڑکی ہوگی اور یکایک یہ اپنی آنکھوں سے (وہ سب کچھ جس کی خبر دی جا رہی ہے) دیکھ رہے ہونگے[12]۔ اُس وقت یہ کہیں گے ہائے ہماری کم بختی، یہ تو یوم الجزا ہے —— یہ وہی فیصلے کا دن ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے[13] (حکم ہوگا) گھیر لاؤ سب ظالموں[14] اور ان کے ع

[10] یعنی عالم طلسمات کی باتیں ہیں۔ کوئی جادو کی دنیا ہے جس کا یہ شخص ذکر کر رہا ہے، جس میں مُردے اٹھیں گے، عدالت ہوگی، جنت بسائی جائے گی اور دوزخ کے عذاب ہونگے۔ یا پھر یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ یہ شخص دل چلوں کی سی باتیں کر رہا ہے، اس کی یہ باتیں ہی اس بات کا صریح ثبوت ہیں کہ کسی نے اس پر جادو کر دیا ہے جس کی وجہ سے بھلا چنگا آدمی یہ باتیں کرنے لگا۔

[11] یعنی اللہ جو کچھ بھی تمہیں بنانا چاہے بنا سکتا ہے۔ جب اس نے چاہا اُس کے ایک اشارے پر تم وجود میں آگئے۔ جب وہ چاہے گا اس کے ایک اشارے پر تم مر جاؤ گے۔ اور پھر جس وقت بھی وہ چاہے گا اس کا ایک اشارہ تمہیں اٹھا کھڑا کریگا۔

[12] یعنی جب یہ بات ہونے کا وقت آئے گا تو دنیا کو دوبارہ برپا کر دینا کوئی بڑا لمبا چوڑا کام نہ ہوگا۔ بس ایک ہی جھڑکی سوتوں کو جگا اٹھانے کے لیے کافی ہوگی۔ "جھڑکی" کا لفظ یہاں بہت معنی خیز ہے۔ اس سے بعث بعد الموت کا کچھ ایسا نقشہ نگاہوں کے سامنے آتا ہے کہ ابتدائے آفرینش سے قیامت تک جو انسان مرے تھے وہ گویا سوتے پڑے ہیں، یکایک کوئی ڈانٹ کر کہتا ہے "اٹھ جاؤ" اور بس آن کی آن میں وہ سب اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

[13] ہو سکتا ہے کہ یہ بات اُن سے اہل ایمان کہیں، ہو سکتا ہے کہ یہ فرشتوں کا قول ہو، ہو سکتا ہے کہ میدانِ حشر

ساتھیوں[۱۵] کو اور اُن معبودوں کو جن کی وہ خدا کو چھوڑ کر بندگی کیا کرتے تھے[۱۶]، پھر ان سب کو جہنم کا راستہ دکھاؤ۔ اور ذرا انہیں ٹھیراؤ، اِن سے کچھ پوچھنا ہے۔" کیا ہو گیا تمہیں، اب کیوں ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے؟ ارے، یہ تو اپنے آپ کو (اور ایک دوسرے کو) حوالے کیے دے رہے ہیں![۱۷] اس کے بعد یہ

کا سارا ماحول اُس وقت زبانِ حال سے یہ کہہ رہا ہو، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ خود انہی لوگوں کا ردِّ عمل ہو۔ یعنی اپنے دلوں میں وہ اپنے آپ ہی کو مخاطب کر کے کہیں کہ دنیا میں ساری عمر تم یہ سمجھتے رہے کہ کوئی فیصلے کا دن نہیں آنا ہے، اب آ گئی تمہاری شامت، جس دن کو جھٹلاتے تھے وہی سامنے آ گیا۔

۱۴ ظالم سے مراد صرف وہی لوگ نہیں ہیں جنہوں نے دوسروں پر ظلم کیا ہو، بلکہ قرآن کی اصطلاح میں ہر وہ شخص ظالم ہے جس نے اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں بغاوت و سرکشی اور نافرمانی کی راہ اختیار کی ہو۔

۱۵ اصل میں لفظ "ازواج" استعمال کیا گیا ہے جس سے مراد ان کی وہ بیویاں بھی ہو سکتی ہیں جو اس بغاوت میں ان کی رفیق تھیں، اور وہ سب لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو انہی کی طرح باغی و سرکش اور نافرمان تھے۔ علاوہ بریں اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ایک ایک قسم کے مجرم الگ الگ جتھوں کی شکل میں جمع کیے جائیں گے۔

۱۶ اس جگہ معبودوں سے مراد دو قسم کے معبود ہیں۔ ایک، وہ انسان اور شیاطین جن کی اپنی خواہش اور کوشش یہ تھی کہ لوگ خدا کو چھوڑ کر اُن کی بندگی کریں۔ دوسرے وہ اصنام اور شجر و حجر وغیرہ جن کی پرستش دنیا میں کی جاتی رہی ہے۔ ان میں سے پہلی قسم کے معبود تو خود مجرمین میں شامل ہوں گے اور انہیں سزا کے طور پر جہنم کا راستہ دکھایا جائے گا۔ اور دوسری قسم کے معبود اپنے پرستاروں کے ساتھ اس لیے جہنم میں ڈالے جائیں گے کہ وہ انہیں دیکھ کر ہر وقت شرمندگی محسوس کریں اور اپنی حماقتوں کا ماتم کرتے رہیں۔ ان کے علاوہ ایک تیسری قسم کے معبود وہ بھی ہیں جنہیں دنیا میں پوجا تو گیا ہے مگر خود ان کا اپنا ایما ہرگز یہ نہ تھا کہ ان کی پرستش کی جائے، بلکہ اس کے برعکس وہ ہمیشہ انسانوں کو غیر اللہ کی پرستش سے منع کرتے رہے، مثلاً فرشتے، انبیاء اور اولیاء۔ اس قسم کے معبود ظاہر ہے کہ اُن معبودوں میں شامل نہ ہوں گے جنہیں اپنے پرستاروں کے ساتھ جہنم کی طرف دھکیلا جائے گا۔

۱۷ پہلا فقرہ مجرمین کو خطاب کر کے ارشاد ہو گا۔ اور دوسرا فقرہ اُن عام حاضرین کی طرف رُخ کر کے

ایک دوسرے کی طرف مڑیں گے اور باہم تکرار شروع کر دیں گے۔ (پیروی کرنے والے اپنے پیشواؤں سے) کہیں گے "تم ہمارے پاس سیدھے رُخ سے آتے تھے"[۲۹] وہ جواب دیں گے "نہیں، بلکہ تم خود

فرمایا جائے گا جو اُس وقت جہنم کی طرف مجرمین کی روانگی کا منظر دیکھ رہے ہونگے۔ یہ فقرہ خود بتا رہا ہے کہ اُس وقت حالت کیا ہوگی۔ بڑے بڑے بیکڑ مجرمین کے کس بل نکل چکے ہونگے اور کسی مزاحمت کے بغیر وہ کان دبائے جہنم کی طرف جا رہے ہونگے۔ کہیں کوئی ہز میجیسٹی دھکے کھا رہے ہونگے اور درباریوں میں سے کوئی "اعلیٰ حضرت" کو بچانے کے لیے آگے نہ بڑھے گا۔ کہیں کوئی فاتح عالم انتہائی ذلت کے ساتھ چلا جا رہا ہوگا اور اس کا لشکرِ جرار خود اسے سزا کے لیے پیش کر دیگا۔ کہیں کوئی پیر صاحب یا گرو جی یا ہولی فادر واصل بجہنم ہو رہے ہونگے اور مریدوں میں سے کسی کو یہ فکر نہ ہوگی کہ حضرت والا کی توہین نہ ہونے پائے۔ کہیں کوئی لیڈر صاحب کس مپرسی کے عالم میں جہنم کی طرف رواں دواں ہونگے اور دنیا میں جو لوگ ان کی کبریائی کے جھنڈے اٹھائے پھرتے تھے وہ سب وہاں اُن کی طرف سے نگاہیں پھیر لیں گے۔ حد یہ ہے کہ جو عاشق دنیا میں اپنے معشوق پر جان چھڑکتے تھے انہیں بھی اس کے حالِ بد کی کوئی پروا نہ ہوگی۔ اس حالت کا نقشہ کھینچ کر اللہ تعالیٰ دراصل یہ بات ذہن نشین کرانا چاہتا ہے کہ دنیا میں انسان اور انسان کے جو تعلقات اپنے رب سے بغاوت پر مبنی ہیں وہ کس طرح آخرت میں ٹوٹ کر رہ جائیں گے، اور یہاں جو لوگ ہمچو ما دیگرے نیست کے غرور میں مبتلا ہیں، وہاں ان کا تکبر کس طرح خاک میں مل جائے گا۔

۲۹ اصل الفاظ ہیں کُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْیَمِیْنِ "تم ہمارے پاس یمین کی راہ سے آتے تھے"۔ یمین کا لفظ عربی زبان میں متعدد مفہومات کے لیے بولا جاتا ہے۔ اگر اس کو قوت و طاقت کے معنی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ ہم کمزور تھے اور تم ہم پر غالب تھے، اس لیے تم اپنے زور سے ہم کو گمراہی کی طرف کھینچ لے گئے۔ اگر اس کو خیر اور بھلائی کے معنی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ تم نے خیر خواہ بن کر ہمیں دھوکا دیا۔ تم ہمیں یقین دلاتے رہے کہ جس راہ پر تم ہمیں چلا رہے ہو یہی حق اور بھلائی کی راہ ہے۔ اس لیے ہم تمہارے فریب میں آگئے۔ اور اگر اسے قسم کے معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم نے قسمیں کھا کھا کر ہمیں اطمینان دلایا تھا کہ حق وہی ہے جو تم پیش کر رہے ہو۔

ایمان لانے والے نہ تھے۔ ہمارا تم پر کوئی زور نہ تھا، تم خود ہی سرکش لوگ تھے۔ آخر کار ہم اپنے رب کے اس فرمان کے مستحق ہو گئے کہ ہم عذاب کا مزا چکھنے والے ہیں۔ سو ہم نے تم کو بہکایا، ہم خود بہکے ہوئے تھے۔[۱۹]

اس طرح وہ سب اس روز عذاب میں مشترک ہوں گے۔[۲۰] ہم مجرموں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے کہ جب ان سے کہا جاتا "اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے" تو یہ گھمنڈ میں آجاتے تھے کہتے تھے "کیا ہم ایک شاعر مجنون کی خاطر اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں؟" حالانکہ وہ حق لے کر آیا تھا اور اس نے رسولوں کی تصدیق کی تھی۔[۲۱] (اب ان سے کہا جائے گا کہ) تم لازماً دردناک سزا کا مزا چکھنے والے ہو۔ اور تمہیں جو بدلہ بھی دیا جا رہا ہے انہی اعمال کا دیا جا رہا ہے جو تم کرتے رہے ہو۔

مگر اللہ کے چیدہ بندے (اس انجام بد سے) محفوظ ہوں گے۔ ان کے لیے جانا بوجھا رزق ہے۔[۲۲]

---

۱۹ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، سورۂ سبا، حواشی نمبر ۵۱-۵۲-۵۳

۲۰ یعنی پیرو بھی اور پیشوا بھی، گمراہ کرنے والے بھی اور گمراہ ہونے والے بھی، ایک ہی عذاب میں شریک ہوں گے۔ نہ پیروؤں کا یہ عذر مسموع ہو گا کہ وہ خود گمراہ نہیں ہوئے تھے بلکہ انہیں گمراہ کیا گیا تھا۔ اور نہ پیشواؤں کی اس معذرت کو قبول کیا جائے گا کہ گمراہ ہونے والے خود ہی راہ راست کے طالب نہ تھے۔

۲۱ رسولوں کی تصدیق کے تین معنی ہیں اور تینوں ہی یہاں مراد بھی ہیں۔ ایک یہ کہ اس نے کسی سابق رسول کی مخالفت نہ کی تھی کہ اس رسول کے ماننے والوں کے لیے اس کے خلاف تعصب کی کوئی معقول وجہ ہوتی، بلکہ وہ خدا کے تمام پچھلے رسولوں کی تصدیق کرتا تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ کوئی نئی اور نرالی بات نہیں لایا تھا بلکہ وہی بات پیش کرتا تھا جو ابتدا سے خدا کے تمام رسول پیش کرتے چلے آرہے تھے۔ تیسرے یہ کہ وہ ان تمام خبروں کا صحیح مصداق تھا جو پچھلے رسولوں نے اس کے بارے میں دی تھیں۔

۲۲ یعنی ایسا رزق جس کی تمام خوبیاں بتائی جا چکی ہیں، جس کے ملنے کا انہیں یقین ہے، جس کے متعلق انہیں یہ بھی اطمینان ہے کہ وہ ہمیشہ ملتا رہے گا، جس کے بارے میں یہ خطرہ لگا ہوا نہیں ہے کہ کیا خبر،

ہر طرح کی لذیذ چیزیں ۲۳؎ ۔ اور نعمت بھری جنّتیں جن میں وہ عزّت کے ساتھ رکھے جائیں گے تختوں پر آمنے سامنے بیٹھیں گے۔ شراب ۲۴؎ کے چشموں ۲۵؎ سے ساغر بھر بھر کر ان کے درمیان پھرائے جائیں گے ۲۶؎

ملے یا نہ ملے۔

۲۳؎ اس میں ایک لطیف اشارہ اس طرف بھی ہے کہ جنت میں کھانا غذا کے طور پر نہیں بلکہ لذت کے لیے ہوگا۔ یعنی وہاں کھانا اس غرض کے لیے نہ ہوگا کہ جسم کے تحلیل شدہ اجزاء کی جگہ دوسرے اجزاء غذا کے ذریعہ سے مہیا کیے جائیں، کیونکہ اُس ابدی زندگی میں سرے سے اجزائے جسم تحلیل ہی نہ ہونگے، نہ آدمی کو بھوک لگے گی جو اس دنیا میں تحلیل کے عمل کی وجہ سے لگتی ہے، اور نہ جسم اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے غذا مانگے گا۔ اسی بنا پر جنت کے اُن کھانوں کے لیے "فواکہ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے مفہوم میں تغذیہ کے بجائے تلذّذ کا پہلو نمایاں ہے۔

۲۴؎ اصل میں یہاں شراب کی تصریح نہیں ہے بلکہ صرف کاس (ساغر) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن عربی زبان میں کاس کا لفظ بول کر ہمیشہ شراب ہی مراد لی جاتی ہے۔ جس پیالے میں شراب کے بجائے دودھ یا پانی ہو، یا جس پیالے میں کچھ نہ ہو اسے کاس نہیں کہتے۔ کاس کا لفظ صرف اسی وقت بولا جاتا ہے جب اس میں شراب ہو۔

۲۵؎ یعنی وہ شراب اُس قسم کی نہ ہوگی جو دنیا میں پھلوں اور غلّوں کو سڑا کر کشید کی جاتی ہے بلکہ وہ قدرتی طور پر چشموں سے نکلے گی اور نہروں کی شکل میں بہے گی۔ سورۂ محمد میں اسی مضمون کو صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے: "وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ" "اور شراب کی نہریں جو پینے والوں کے لیے لذت ہونگی"۔

۲۶؎ یہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ شراب کے یہ ساغر لے کر جنتیوں کے درمیان گردش کون کریگا۔ اس کی تفصیل دوسرے مقامات پر ارشاد ہوئی ہے: "وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ" "اور ان کی خدمت کے لیے گردش کریں گے اُن کے خادم لڑکے، ایسے خوبصورت جیسے صدف میں چھپے ہوئے موتی"۔ (الطور، آیت ۲۴) "وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ اِذَا رَاَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا" اور

چمکتی ہوئی شراب، جو پینے والوں کے لیے لذّت ہوگی۔ نہ ان کے جسم کو اس سے کوئی ضرر ہوگا اور نہ ان کی عقل اس سے خراب ہوگی۔[۲۷] اور ان کے پاس نگاہیں بچانے والی،[۲۸] خوبصورت آنکھوں والی عورتیں ہوں گی،[۲۹] ایسی نازک جیسے انڈے کے چھلکے کے نیچے چھپی ہوئی جھلی۔[۳۰]

ان کی خدمت کے لیے گردش کریں گے ایسے لڑکے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہنے والے ہیں۔ تم انہیں دیکھو تو سمجھو کہ موتی بکھیر دیے گئے ہیں"۔ (الدھر، آیت ۱۹)۔ پھر اس کی مزید تفصیل حضرت اَنس اور حضرت سَمُرَہ بن جُندُب کی اُن روایات میں ملتی ہے جو انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم سے نقل کی ہیں۔ اُن میں بتایا گیا ہے کہ "مشرکین کے بچے اہلِ جنّت کے خادم ہوں گے" (ابوداؤد طیالسی، طَبَرانی، بَزّار)۔ یہ روایات اگرچہ سنداً ضعیف ہیں، لیکن متعدد دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جو بچے سنِّ رشد کو نہیں پہنچے ہیں وہ جنّت میں جائیں گے۔ پھر یہ بھی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جن بچوں کے والدین جنّتی ہوں گے وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ رہیں گے۔ اس کے بعد لامحالہ وہ بچے رہ جاتے ہیں جن کے ماں باپ جنّتی نہ ہوں گے۔ سو اُن کے متعلق یہ بات معقول معلوم ہوتی ہے کہ وہ اہلِ جنّت کے خادم بنا دیے جائیں۔ (اس کے متعلق تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو فتح الباری اور عمدۃ القاری، کتاب الجنائز، باب ما قیل فی اولاد المشرکین۔ نیز رسالہ ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۵۷ء)

[۲۷] یعنی وہ شراب اُن دونوں قسم کی خرابیوں سے خالی ہوگی جو دنیا کی شراب میں ہوتی ہیں۔ دنیا کی شراب میں ایک قسم کی خرابی یہ ہوتی ہے کہ آدمی کے قریب آتے ہی پہلے تو اس کی بدبُو اور سڑاند ناک میں پہنچتی ہے۔ پھر اس کا مزا آدمی کے ذائقے کو تلخ کرتا ہے۔ پھر حلق سے اترتے ہی وہ پیٹ پکڑ لیتی ہے۔ پھر وہ دماغ کو چڑھتی ہے اور دورانِ سر لاحق ہوتا ہے۔ پھر وہ جگر کو متأثر کرتی ہے اور آدمی کی صحت پر اس کے بُرے اثرات مترتب ہوتے ہیں۔ پھر جب اس کا نشہ اُترتا ہے تو آدمی خمار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ سب جسمانی ضرر ہیں۔ دوسری قسم کی خرابی یہ ہوتی ہے کہ اسے پی کر آدمی بہکتا ہے، اَول فَول بکتا ہے اور عربدہ کرتا ہے۔ یہ شراب کے عقلی نقصانات ہیں۔ دنیا میں انسان صرف سُرور کی خاطر شراب کے یہ سارے نقصانات برداشت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جنّت کی شراب میں سُرور تو پوری طرح ہوگا (لذّۃ للشاربین)، لیکن ان دونوں قسم کی خرابیوں میں سے کوئی خرابی بھی اس میں نہ ہوگی۔

پھر وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر حالات پوچھیں گے۔ ان میں سے ایک کہے گا، "دنیا میں میرا ایک ہم نشین تھا جو مجھ سے کہا کرتا تھا، کیا تم بھی تصدیق کرنے والوں میں سے ہو؟[۳۱] کیا واقعی جب ہم مر چکے ہوں گے اور مٹی ہو جائیں گے اور ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ جائیں گے تو ہمیں جزا و سزا دی جائے گی؟ اب کیا آپ لوگ دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ صاحب اب کہاں ہیں"؟ یہ کہہ کر جونہی وہ جھکے گا تو جہنم کی گہرائی میں اس کو دیکھ لے گا اور اس سے خطاب کر کے کہے گا "خدا کی قسم تو تو مجھے تباہ کر دینے والا تھا۔ میرے رب کا فضل شاملِ حال نہ ہوتا تو آج میں بھی اُن لوگوں میں سے ہوتا جو پکڑے ہوئے آئے ہیں۔[۳۲] اچھا تو کیا اب ہم مرنے والے نہیں ہیں؟ موت جو

۲۸؎ یعنی اپنے شوہر کے سوا کسی اور کی طرف نگاہ نہ کرنے والی۔

۲۹؎ بعید نہیں ہے کہ یہ وہ لڑکیاں ہوں جو دنیا میں سنِ رشد کو پہنچنے سے پہلے مر گئی ہوں اور جن کے والدین جنت میں جانے کے مستحق نہ ہوئے ہوں۔ یہ بات اس قیاس کی بنا پر کہی جا سکتی ہے کہ جس طرح ایسے لڑکے اہلِ جنت کی خدمت کے لیے مقرر کر دیئے جائیں گے اور وہ ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے، اسی طرح ایسی لڑکیاں بھی اہلِ جنت کی رفیقِ حیات بنا دی جائیں گی اور وہ ہمیشہ نوخیز لڑکیاں ہی رہیں گی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۳۰؎ اصل الفاظ ہیں کَاَنَّھُنَّ بَیْضٌ مَّکْنُوْنٌ۔ "گویا وہ چھپے ہوئے یا محفوظ رکھے ہوئے انڈے ہیں"۔ ان الفاظ کی مختلف تعبیرات اہلِ تفسیر نے بیان کی ہیں، مگر صحیح تفسیر وہی ہے جو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ میں نے اس آیت کا مطلب حضورؐ سے پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ ان کی نرمی و نزاکت اُس جھلی جیسی ہو گی جو انڈے کے چھلکے اور اس کے گودے کے درمیان ہوتی ہے (ابن جریر)۔

۳۱؎ یعنی تم بھی ایسے ضعیف الاعتقاد ہو کہ زندگی بعد موت جیسی بعید از عقل بات کو مان بیٹھے۔

۳۲؎ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آخرت میں انسان کی سماعت اور بینائی اور گویائی کس پیمانے کی ہو گی۔ جنت میں بیٹھا ہوا ایک آدمی جب چاہتا ہے کسی ٹیلیویژن کے آلے کے بغیر بس یونہی جھک کر ایک ایسے شخص کو دیکھ لیتا ہے جو اس سے نہ معلوم کتنے ہزار میل کے فاصلے پر جہنم میں مبتلائے عذاب ہے۔

ہمیں آنی تھی وہ بس پہلے آچکی ؟ اب ہمیں کوئی عذاب نہیں ہونا ہے؟"[۳۳]
یقیناً یہی عظیم الشان کامیابی ہے۔ ایسی ہی کامیابی کے لیے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے۔ بولو، یہ ضیافت اچھی ہے یا زقّوم[۳۴] کا درخت؟ ہم نے اس درخت کو ظالموں کے لیے فتنہ بنا دیا ہے[۳۵]۔ وہ ایک درخت ہے جو جہنّم کی تہ سے نکلتا ہے۔ اُس کے شگوفے ایسے ہیں جیسے شیطانوں کے سر[۳۶]۔ جہنّم کے لوگ اسے کھائیں گے اور اسی سے پیٹ بھریں گے، پھر اس پر پینے کے لیے ان کو کھولتا ہوا پانی ملے گا۔ اور اس کے بعد ان کی واپسی اُسی آتشِ دوزخ

پھر بھی نہیں کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں، بلکہ ان کے درمیان کسی ٹیلیفون یا ریڈیو کے توسط کے بغیر براہِ راست کلام بھی ہوتا ہے۔ وہ اتنے طویل فاصلے سے بات کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی بات سنتے ہیں۔

۳۳ انداز کلام صاف بتا رہا ہے کہ اپنے اُس دوزخی یار سے کلام کرتے کرتے یکایک یہ جنتی شخص اپنے آپ سے کلام کرنے لگتا ہے اور یہ تین فقرے اس کی زبان سے اس طرح ادا ہوتے ہیں جیسے کوئی شخص اپنے آپ کو ہر توقع اور ہر اندازے سے برتر حالت میں پا کر انتہائی حیرت و استعجاب اور وفورِ مسرت کے ساتھ آپ ہی آپ بول رہا ہو۔ اس طرح کے کلام میں کوئی خاص شخص مخاطب نہیں ہوتا اور نہ اس کلام میں جو سوالات آدمی کرتا ہے ان سے درحقیقت کوئی بات کسی سے پوچھنا مقصود ہوتا ہے۔ بلکہ اس میں آدمی کے اپنے ہی احساسات کا اظہار اس کی زبان سے ہونے لگتا ہے۔ وہ جنتی شخص اُس دوزخی سے کلام کرتے کرتے یکایک یہ محسوس کرتا ہے کہ میری خوش قسمتی مجھے کہاں سے کہاں لے آئی ہے۔ اب نہ موت ہے نہ عذاب ہے۔ ساری کلفتوں کا خاتمہ ہو چکا ہے اور مجھے حیاتِ جاوداں نصیب ہو چکی ہے۔ اسی احساس کی بنا پر وہ بے ساختہ بول اٹھتا ہے کیا اب ہم اس مرتبے کو پہنچ گئے ہیں؟

۳۴ زقّوم ایک قسم کا درخت ہے جو تہامہ کے علاقے میں ہوتا ہے۔ مزہ اس کا تلخ ہوتا ہے، بُو ناگوار ہوتی ہے۔ اور توڑنے پر اس میں سے دودھ کا سا رس نکلتا ہے جو اگر جسم کو لگ جائے تو

کی طرف ہو گی[۳۷]۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے باپ دادا کو گمراہ پایا اور انہی کے نقشِ قدم پر یہ دوڑ چلے[۳۸]۔ حالانکہ ان سے پہلے بہت سے لوگ گمراہ ہو چکے تھے اور اُن میں ہم نے تنبیہ کرنے والے رسول بھیجے تھے۔ اب دیکھ لو کہ ان تنبیہ کیے جانے والوں کا کیا انجام ہوا۔ اس بدانجامی سے بس اللہ کے وہی بندے بچے ہیں جنہیں اس نے اپنے لیے خالص کر لیا ہے ع۲ ع

ورم ہو جاتا ہے۔ غالباً یہ وہی چیز ہے جسے ہمارے ملک میں تھوہر کہتے ہیں۔

۳۵ یعنی منکرین یہ بات سن کر قرآن پر طعن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر استہزاء کا ایک نیا موقع پا لیتے ہیں۔ وہ اس پر ٹھٹھا مار کر کہتے ہیں، لو اب نئی سنو، جہنم کی دہکتی ہوئی آگ میں درخت اُگے گا۔

۳۶ کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ شیطان کا سر کس نے دیکھا ہے جو زقوم کے شگوفوں کو اس سے تشبیہ دی گئی۔ دراصل یہ تخئیلی نوعیت کی تشبیہ ہے اور عام طور پر ہر زبان کے ادب میں اس سے کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً ہم ایک عورت کی انتہائی خوبصورتی کا تصور دلانے کے لیے کہتے ہیں، وہ پری ہے۔ اور انتہائی بدصورتی بیان کرنے کے لیے کہتے ہیں، وہ چڑیل ہے یا بھتنی ہے۔ کسی شخص کی نورانی شکل کی تعریف میں کہا جاتا ہے، وہ فرشتہ صورت ہے۔ اور کوئی نہایت بھیانک ہیئت کذائی میں سامنے آئے تو دیکھنے والے کہتے ہیں کہ وہ شیطان بنا چلا آ رہا ہے۔

۳۷ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ دوزخ جب بھوک پیاس سے بے تاب ہونے لگیں گے تو انہیں اس مقام کی طرف ہانک دیا جائے گا جہاں زقوم کے درخت اور کھولتے ہوئے پانی کے چشمے ہونگے۔ پھر جب وہ وہاں سے کھا پی کر فارغ ہو جائیں گے تو انہیں دوزخ کی طرف واپس لایا جائیگا۔

۳۸ یعنی انہوں نے خود اپنی عقل سے کام لے کر کبھی نہ سوچا کہ باپ دادا سے جو طریقہ چلا آ رہا ہے وہ درست بھی ہے یا نہیں۔ بس آنکھیں بند کر کے اسی ڈگر پر ہو لیے جس پر دوسروں کو چلتے دیکھا۔

مغربی مادیت کے مآخذ

مریم جمیلہ (امریکن نومسلمہ)
(ترجمہ: عثمان غنی)

مذہبی اصولوں کی تفصیلات میں واضح اختلافات اور نمایاں سیاسی رقابت کے باوجود قرونِ وسطیٰ کے مسیحی یورپ اور مسلمان دنیا میں ایک بنیادی قدرِ مشترک پائی جاتی تھی۔ اُس وقت مسلمانوں اور نصرانیوں دونوں کے فکر کا مرکز اخروی فلاح تھی مسلمان بھی اور عیسائی بھی یہ تسلیم کرتے رہے کہ پیغمبروں کے ذریعے مقدس اور الہامی کتابوں میں جو اخلاقی قدریں اللہ تعالیٰ نے بتائی ہیں وہ مستقل اور ابدی ہیں۔ کسی کو اس بارے میں شک نہ تھا کہ خدائی احکام کے مقابلے میں بغاوت کے نتائج ناقابلِ بیان حد تک ہولناک ہوں گے۔ اس دنیا کی زندگی میں برضا و رغبت اللہ تعالیٰ کی مرضی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا ہر کسی کے نزدیک دوسری دنیا میں لازوال نعمتوں کی یقینی ضمانت تھا۔

قرونِ وسطیٰ کی مسیحی اور مسلمان دنیا میں سارے اعتقادی اختلافات سے بالاتر ہو کر مشترک مذہبی قدریں آزادانہ تہذیبی تبادلوں کے ذریعے نافذ کی گئیں۔ سپین میں بڑی خوفناک لڑائیاں بھی ہوئیں، مگر وہ بھی ہزاروں عیسائی علماء کو قرطبہ، غرناطہ اور شمالی افریقہ کی عظیم مسلمان یونیورسٹیوں میں شرکت اور ان سے استفادہ سے روک نہ سکیں۔ پادری سلوسٹر (SYLVESTER) نے، جو یورپ میں صفر، اعشاریہ اور دوسرے عربی اعداد متعارف کرانے والا ہے، قرطبہ یونیورسٹی میں تعلیم پائی تھی۔ مسلمان مفکرین نے بھی اور عیسائی فلسفیوں نے بھی اپنے اپنے نظریات کو ارسطو کی منطق سے قوت پہنچانے کی کوشش کی۔ یہ کوئی محض اتفاق نہیں کہ وہی تھامس اکوئیناس (ST. THOMAS ACQUIN) جو اپنی تحریروں میں اسلام پر زوردار حملے کرتا ہے۔ ابن سینا، غزالی اور ابن رشد کا نہایت مشتاق طالب علم تھا۔ یہ تدریجی پس منظر ذہن میں رکھا جائے تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں رہ جاتی کہ دانتے (DANTE)

کے "ملکوتی طربیہ" اور ابن العربی کے بیانِ معراج نبویؐ میں اتنی واضح مماثلت پائی جاتی ہے۔ عیسائی ولی فرانسس اسیسی (FRANCIS ASSISSI) اور عظیم صوفی شاعر ابن الفرید کی گہری ذاتی دوستی شاید اُس روحانی تعلق کا بہترین مظہر ہے جو قرونِ وسطیٰ کے مسیحی یورپ اور اس وقت کی مسلمان دنیا میں پایا جاتا تھا۔

یورپ میں نشأۃ ثانیہ کا آغاز ہوا تو اُس کی اور مسلمان دنیا کی ذہنی و نظری فضا میں بُعد برابر بڑھتا گیا۔ شہروں میں اضافے اور تجارت کے پھیلاؤ کی وجہ سے شہری معاشرہ میں ایک ایسا غالب درمیانی طبقہ پیدا ہوتا گیا جس نے کلیسا اور پادری کو پیچھے دھکیل دیا۔ مضبوط مرکزی حکومتوں کی مدد سے تیار کردہ فوجوں نے جاگیرداروں کے خلاف بغاوت کر کے ان کی جائدادیں ضبط کر لیں۔ پادریوں کے بجائے علوم و فنون کی سرپرستی تاجر، ساہوکار اور بادشاہ کرنے لگے۔ جب آخرت سے قطع نظر کر کے اسی دنیا میں ہر فرد کی ساری صلاحیتوں کے ہر جائز و ناجائز طریقے سے ارتقاء پر پورا زور دیا جانے لگا تو اس وقت اُس جدید مغربی تہذیب نے جنم لیا جسے آج ہم اس کی موجودہ شکل میں دیکھ رہے ہیں

بڑی گرمجوشی کے ساتھ نشأۃ ثانیہ کے علماء نے یونان اور روم کے قدیم لٹریچر کی طرف رجوع کیا۔ اب چونکہ خدا کے بجائے مطلق انسانی فہم و فراست پر ایمان لایا گیا تھا اس لیے نشأۃ ثانیہ کے علماء نے کلیسا سے روحانی تعلقات منقطع کر کے مادہ پرستانہ اور کافرانہ فلسفوں سے رشتہ جوڑنے میں اپنے آپ کو حق بجانب پایا۔ قرونِ وسطیٰ میں مثالی تصور کی جانے والی خانقاہی زندگی کا مذاق اڑایا گیا اور اس پر پھبتیاں چست کی گئیں۔ دنیا پرستی اور دولت نے خود کلیسا کو بہت بگاڑ دیا حتیٰ کہ حالت یہ ہو گئی کہ بعض پادریوں اور راہبوں کے عیاشانہ ماحول میں اور بے دین شہنشاہوں کے ایوانوں میں کوئی فرق باقی نہ رہ گیا۔

پروٹسٹنٹ تحریکِ اصلاحِ مذہب نے کلیسا پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ اس کے بعد وہ آج تک جانبر نہ ہو سکا۔ مارٹن لوتھر نے کلیسا کی خرابیاں دور کرنے پر اکتفا نہ کیا بلکہ اسے بالکل ختم کر کے اپنا ایک نیا مذہب ایجاد کرنے کا اُس نے تہیہ کر لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ رومن چرچ میں اتنا فساد

اور بگاڑ نہیں پیدا ہوا تھا جتنا عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ دولت میں فراوانی کے ساتھ جرمنی کا کاروباری طبقہ دن بدن راہبانہ نظریۂ زندگی اور روم کی روحانی برتری کے زیادہ سے زیادہ خلاف ہوتا چلا گیا۔ انہوں نے اس بات کا پرچار کیا کہ دنیوی ترقی اور مادی خوشحالی خدا کی خوشنودی کی محسوس علامتیں ہیں اور غربت اس کا عذاب ہے۔ اس طبقے نے خلوت کو خود غرضی اور مراقبوں اور فکر کو بیکاری اور کاہلی سے تعبیر کیا۔ مارٹن لوتھر نے پوپ کے اختیارات کے خلاف جو بغاوت کی اور اس کے منصب اور خانقاہی زندگی کے خاتمے کے لیے جو کوشش کی، اس سے بہت سے مسلمان مفکرین یہ سمجھتے ہیں کہ پروٹسٹنٹ نظریات اس بات کا ثبوت ہیں کہ عیسائیت ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی اسلام کے قریب آرہی ہے۔ لیکن گہرا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ رجائیت حق بجانب نہیں۔ پادریوں کا اقتدار ختم کر کے جب صرف الہامی کتاب کو سند قرار دیا گیا تو اس سے ہر فرد بشر کو کھلی چھٹی مل گئی کہ وہ مسیحی روایات کو نظر انداز کر کے بائیبل کی من مانی تعبیر و تاویل کرے اور اپنی مرضی اور سہولت کے پیش نظر اس میں سے جس چیز کو چاہے قبول کرے اور جس چیز کو چاہے رد کر دے۔ پروٹسٹنٹ رہنماؤں نے لاطینی زبان کی اہمیت سے انکار کر کے انجیل کا مقامی زبانوں میں ترجمہ کیا اور اس سے بائیبل میں مزید تحریفیں ہوئیں۔ اس طرح پوپ کے منصب اور لاطینی زبان کی اہمیت سے انکار نے لادینی قومیت کے نظریہ کو بڑی تقویت پہنچائی تمام پروٹسٹنٹ ممالک میں علیحدہ قومی کلیسا حکومت کے مکمل کنٹرول کے تحت منظم کیے گئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ میں ہر جگہ مذہب کی روحانی قوت لادینی سیاست کے مفاد کو آگے بڑھانے کے لیے استعمال کی گئی۔

مضبوط متحد عیسائیت کے بجائے اب ایسے چھوٹے چھوٹے اور کمزور کمزور مجتمعات معرض وجود میں آگئے جن کے اپنے اپنے محدود، مقامی اور تنگ نقطہ ہائے نظر تھے۔ پروٹسٹنٹ مذہب نے نجات کو خالصتہً خدا کے عطا کردہ عقائد کا کرشمہ بتایا اور یہ سکھایا کہ فلاح کا فرد کے اخلاقی معیار اور نیک اعمال کے ساتھ قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ اب اخلاقی قدروں کا خدا کی رضا اور حکم کے ساتھ

کوئی رشتہ نہ رہا۔ مارٹن لوتھر کے متبعین آزاد تھے کہ خدا و آخرت سے بے نیاز ہو کر جیسے چاہیں زندگی گزاریں۔ پروٹسٹنٹ نقطۂ نظر یہ تھا کہ مذہب کلی طور پر پرائیویٹ اور ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دین روزمرہ کی اجتماعی زندگی سے الگ ایک چیز بن کر رہ گیا اور انجام کار پروٹسٹنٹ مذہب صرف اتوار منانے کا نام رہ گیا۔ باقی کا پورا ہفتہ مادی ترقی اور معاشی خوشحالی کے لیے وقف کر دیا گیا۔

یورپین کلچر کی نشأۃ ثانیہ کے ساتھ قرون وسطیٰ کے علماء نے بڑے اشتیاق سے اُن سائنسی علوم کی چھان بین کی جو انہیں مسلمان سپین کی یونیورسٹیوں سے ملے تھے۔ مسلمانوں نے صرف افلاطون اور ارسطو کی تحریریں ہی محفوظ نہیں کی تھیں، اور انہوں نے محض یونانی طب اور ریاضی ہی کو بچا کر نہیں رکھا تھا، بلکہ تجربہ گاہوں میں تجربے کر کے ان میں بڑے اضافے بھی کیے تھے۔ گیرڈ (GERARD) نے اپنی ساری زندگی سائنسی علوم پر مشتمل بانوے کتابوں کا عربی سے ترجمہ کرنے کے لیے وقف کر دی۔ ان کتابوں میں ابن سینا کی "القانون" بھی شامل ہے جو صدیوں تک یورپ کے تمام طبیہ کالجوں میں آخری سند تسلیم کی جاتی رہی ہے۔

بیکن نے "جدید بحر اوقیانوس" میں جدید دور کی سائنسی روح کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ برطانوی جہاز ڈوز بحرالکاہل میں ایک خیالی سرزمین پر لنگر انداز ہوتا ہے۔ اس کا طرۂ امتیاز وہ عظیم الشان ادارہ ہے جو سائنسی تحقیق کے لیے مخصوص ہے۔ وہاں کا فرمانروا جہاز کے مسافروں سے کہتا ہے: "ہمارے ادارے کا مقصد اسباب و علل اور اشیاء کے سربستہ محرکات کا سراغ لگانا ہے اور ہم انسانوں کی فرمانروائی کی حدود میں ہر ممکن چیز لانا چاہتے ہیں۔"

بیکن نے تجرباتی طریقے کی ابتدا کی اور ڈیکارٹ (DESCARTES) نے اسے مزید آگے بڑھایا۔ انہوں نے ارسطو کے اور قرون وسطیٰ کے فلسفیوں کے رعب کو بالکل ختم کر دیا۔ ان لوگوں نے پہلے سے معلوم چیزوں کو محض ثابت کرتے رہنے کے بجائے نئے نئے حقائق معلوم کرنے کے راستے نکالے۔

سائنسی تحقیق اور مذہب میں فی الواقع کوئی اصولی جھڑپ نہیں ہے۔ کیا قرآن اور بائبل دونوں

انسان کو خدا کی وہ بہترین مخلوق تصور نہیں کرتے جس کے تابع باقی تمام مخلوق اور جس کے نفع کے لیے باقی سارے عناصرِ فطرت ہیں ۔ کولمبس سے صدیوں پہلے مسلمان جغرافیہ دانوں کا یہ معلوم کرنا کہ زمین گول ہے اور کاپرنیکس سے کئی سو سال پہلے مسلمان ماہرینِ فلکیات کے یہ اندازے کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے اسلامی نظامِ زندگی کے لیے ذرّہ برابر خطرہ نہ پیدا کر سکے ۔ چونکہ قرآن سکھاتا ہے کہ فطرت انسان کی دوست ہے اس لیے مسلمان سائنسدان اس کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کر کے رہتے رہے اور انہوں نے اس کائنات کو ہمیشہ گھر سمجھا ۔

جدید سائنس کا المیہ یہ نہیں ہے کہ اس نے اتنی بڑی بڑی ایجادات کی ہیں ۔ یہ ایجادات تو نوعِ انسانی کے لیے حد درجہ مفید ثابت ہو سکتی ہیں ۔ اصل المیہ خود ان سائنس دانوں کا غیر منطقی اور محدود مادی نقطۂ نظر ہے ۔ کاپرنیکس (COPERNICUS) کے بعد مغربی ماہرینِ فلکیات نے دیکھا کہ انسان ایک چھوٹے سے سیارے پر ایک باریک سے نقطہ کی حیثیت رکھتا ہے ۔ پھر یہ گھومتا ہوا سیارہ بغیر کسی مقصد کے ایک لا انتہا ہی سمندر جیسے ایک نظامِ شمسی میں جذب سا ہو جاتا ہے ۔ چونکہ خدا، فرشتے اور جن خوردبینوں اور دوربینوں کے ذریعے نظر نہیں آتے تھے اس لیے ان ماہرین نے یہ نتیجہ نکالا کہ اس پیچیدہ سی شمسی مشین میں انسان بالکل اکیلا ہے اور وہ کسی حادثے یا غلطی کی پیداوار ہے مغربی مفکرین نے انسان کو اس کائنات میں اجنبی محسوس کیا ۔ انہیں کسی ایسے خدا کا صریح ثبوت نہ ملا جو انسان کی فلاح و بہبود کا انتظام کرتا ہو ۔ اس لیے زندگی کے مقصد اور مفہوم کی تلاش و تحقیق کو بے سود قرار دیتے ہوئے انہوں نے فطرت کو اپنا حریف گردانا جسے فتح اور مسخر کر کے اپنی مادی ترقی کے لیے استعمال کرنا چاہیے ۔

ڈیکارٹ اور دوسرے مغربی سائنسدانوں کے نزدیک کائنات کی حیثیت بس ایک مشین کی ہے جس کا کوئی اخلاقی و روحانی مقصد نہیں ۔ انسان سمیت تمام جاندار چیزیں کیمیائی عمل اور رد عمل کا نتیجہ ہیں ۔ ڈیکارٹ (DESCARTES) نے تو یہاں تک شیخی بگھار دی کہ مجھے عناصرِ ترکیبی دے دو اور میں تمہیں کائنات بنا دکھاؤں گا ۔

نیوٹن نے یہ نظریہ پیش کیا کہ کائنات کچھ ناقابلِ تغیر اصولوں میں کسی ہوئی ہے۔ اس نظریہ کے نشہ سے مدہوش ہو کر اس نام نہاد منوّر دور کے سرغنہ لوگوں نے یہ تعلیم دی کہ وہ تمام اعتقادات اٹھا پھینکنے کے لائق ہیں جو انسانی تجربہ و مشاہدہ کے خلاف ہوں۔ معجزات، وحی، نبوت اور مذہبی تقریبات و عبادات کا یہ کہہ کر مذاق اڑایا گیا کہ یہ تو توہمات ہیں۔ والٹیر (VOLTAIRE) نے خدا کا تصور قرآن اور بائیبل دونوں سے مختلف پیش کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ خدا نے اس کائنات کو بالکل اسی طرح بنایا جس طرح ایک گھڑی ساز گھڑی کے پُرزے جمع کرتا اور انہیں ترتیب دیتا ہے اور اس کے بعد گھڑی کے ساتھ اس کا تعلق نہیں رہتا۔ ہیوم (HUME) نے تمام دینی اعتقادات کا اس لیے انکار کیا کہ اس کے نزدیک وہ سائنسی تجربات اور استدلال کے ذریعے ثابت نہیں کیے جا سکتے۔ اس نے والٹیر کے اُس بے جان اور بے کار خدا پر بھی یہ کہہ کر حملہ کیا کہ ہم نے گھڑیاں بنتے ہوئے تو دیکھی ہیں لیکن دنیائیں بنتی نہیں دیکھیں، اس لیے یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ہم خدا کو مانیں۔ ہیوم (HUME) نے کہا کہ اگر بالفرض کائنات کا کوئی بنانے والا تھا تو ہو سکتا ہے کہ وہ ایک ناکارہ سا کاریگر ہو، ہو سکتا ہے وہ کام ختم کر کے کبھی کا مر چکا ہو، ہو سکتا ہے کہ وہ مرد ہو یا عورت، ہو سکتا ہے کہ وہ ایک سے زیادہ ہوں، یہ بھی ممکن ہے کہ وہ سراسر خیر ہو، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ سراسر شر ہو، اس کا بھی امکان ہے کہ وہ خیر و شر کا مجموعہ ہو، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ نہ ہو، اور غالباً یہ آخری بات ہی ٹھیک ہے۔ انکارِ آخرت کی دلیل ہیوم (HUME) نے اس طرح دی، وہ زندگی جس میں جزا و سزا انسانی اعمال کے مطابق نہ ہو اس سے ہم یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ کوئی اور ایسی زندگی ضرور ہو گی جہاں اس طرح انصاف ہو گا۔

اخلاق کو ریاضی کی طرح ایک سائنس تصور کیا گیا۔ جس طرح انسانی علوم کے دوسرے بے شمار شعبے مذہب سے آزاد ہیں اسی طرح اخلاقیات کا بھی دین سے کوئی تعلق نہ رہنے دیا گیا۔ ڈیڈروٹ (DIDEROT) اور روسو (ROUSSEAU) ایسے فلسفی اس بات پر متفق ہو گئے کہ فائدہ اور مسرت اخلاق کا واحد معیار ہیں۔ انہوں نے پورے عزم کے ساتھ اُن اخلاقی معیاروں کے خلاف جنگ کی جن کی کوئی فوری افادیت اور قدر و قیمت نہیں۔ انہوں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ دوسرے انسانوں کے جائز حصّے کو غصب

کیے بغیر ہر قسم کے ذرائع سے ایک آدمی اس زندگی میں جتنی خوشی حاصل کر سکتا ہے اسے کرنی چاہیے۔ جو تعلقات تعلق رکھنے والوں کو مسرت مہیا کریں وہ جس نوعیت کے بھی ہوں، ہر حال میں مفید ہی ہوں گے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنسی تعلقات میں عصمت و عفت کے تقاضوں کو بے سُود اور مہمل گردانا گیا اور صرف وہ خوشیاں جو معاشرے پر فوراً اور براہِ راست بُرا اثر ڈالتی ہوں، انہیں متروک قرار دیا گیا۔ اس نام نہاد عہدِ تہذیب و ترقی کے فلسفی مذہبی آزادی کے علمبردار اس وجہ سے نہیں بنے کہ وہ رواداری کے اصول پر ایمان رکھتے تھے، بلکہ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ انہیں مذہب سے کوئی دلچسپی ہی نہ تھی، ورنہ رواداری نام کی کوئی چیز فی الحقیقت ان میں نہیں پائی جاتی۔

جنہیں یہ ماضی کی "احمقانہ غلطیاں" کہتے تھے انہیں نیست و نابود کر کے یہ "روشن خیال" سمجھنے لگے کہ اب یہ سائنس اور عقل کی عالمگیر تعلیم کے ذریعے زمین پر بہشت بنا دیں گے۔ ان کا خیال تھا کہ سائنس وہ "جادو کی چابی" ہے جس کے ذریعے انسان خود اپنی مرضی سے اپنی قسمت بنائے گا۔ آزادی، معاشی و معاشرتی مساوات اور عالمگیر امن و چین کا دَور دورہ ہو گا۔ انہیں یقین تھا کہ علم طب کی ترویج و ترقی سے ساری بیماریاں اور مصیبتیں ختم ہو جائیں گی اور انسانی زندگی یہاں لامتناہی ہو جائے گی۔ بعد کی صدی میں سائنسی معلومات کے اندر جو انقلابات آئے ان سے ان لوگوں کا یہ یقین پختہ تر ہو گیا کہ کسی مافوق الفطرت ہستی کی مدد کے بغیر ہی اس زمین پر انسانی زندگی مکمل اور پائیدار ہو جائے گی۔

ڈارون نے یہ نظریہ پیش کیا کہ انسان نے "زندگی" کی ابتدائی شکلوں سے بتدریج ارتقاء کیا ہے۔ اس نظریہ نے اقدار کا پیمانہ ہی یکسر تبدیل کر دیا۔ اب فلسفی یہ سمجھنے لگے کہ انسانی معاشرہ پیہم تغیر کی حالت میں ہے اور یہ تغیر لامحالہ ارتقاء کی اعلیٰ منازل ہی کی طرف جا رہا ہے۔ حیاتیاتی ارتقاء کے اصولوں کو انسانی سوسائٹی پر منطبق کیا گیا تو "جدید"، "ترقی یافتہ" اور "ترقی پذیر" جیسی اصطلاحات اور الفاظ سب سے زیادہ پسندیدہ سمجھے جانے لگے۔ مؤرخین آئے۔ انہوں نے انسان پر فطرت کی تخلیق اور اس کے ایک حصے کی حیثیت سے نظر ڈالی۔ انہوں نے خیال کیا کہ انسان ایک متحارب ماحول کے

خلاف کامیابی سے کشمکش کرتے ہوئے نچلے مدارج سے ترقی کر کے اپنی اس حالت کو پہنچا ہے ڈارون نے مغربی مفکرین کو قائل کر دیا کہ انسان بلاشبہ دوسرے حیوانات سے بلند تر ہوتے ہوئے بھی بس ایک حیوان ہی ہے۔ ولیم جیمز (W JAMES) نے انسانی شعور یا انسانی ذہن کو ناقابل فہم قرار دیتے ہوئے اس تصور پر بھی حملہ کیا۔ اس نے کہا کہ جسے ہم غور و فکر یا سوچ بچار کہتے ہیں اس کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ اعصابی نظام پر خارجی محرکات کے کیمیائی رد عمل کا نتیجہ ہے۔ پالوف (PAVLOV) کی طرح کے ماہرین نفسیات نے انسانی رویے کے محرکات کا اندازہ لگانے کے لیے کتوں اور بندروں کے طرز عمل کا مطالعہ شروع کیا۔

فرائڈ (FREUD) نے انکشاف کیا کہ بچپن میں انسان کے لاشعور میں کچھ ایسی چیزیں بیٹھ جاتی ہیں جو بعد میں غیر عقلی رویے کا باعث بنتی ہیں۔ اس انکشاف کو فلسفیوں نے مذہب کے خلاف ایک مزید ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ فرائڈ نے یہ دعویٰ کیا کہ چونکہ چھوٹے بچے کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ اس کے والدین نے اسے زندگی دی اور وہ اسے نقصان سے بچاتے ہیں، اس کے والدین اس کی زندگی کو منضبط کرتے اور اسے سزا یا انعام دیتے ہیں، لہٰذا جب وہ جوان ہوتا ہے تو یہی چیزیں مذہبی اعتقادات کا روپ دھار لیتی ہیں۔ یہ تصور کہ مذہب انسان کی بنائی ہوئی ایک چیز ہے اور اخلاقی قدریں مستقل نہیں بلکہ اضافی ہیں، علم الانسان سے بحث کرنے والوں کے ہاں بڑا مقبول ہوا۔ علم الانسان سے بحث کرنے والے بہت سے لوگ رلیف لنٹن (LINTON) سے اتفاق کرتے ہوئے نظر آئیں گے کہ اسلام کا بے لچک نظریۂ توحید سامی قبائل کے اس تشدد پر مبنی عائلی نظام کی پیداوار ہے، جس میں مرد خاندان کا مختار کل سربراہ ہوتا تھا۔ لنٹن اپنی کتاب "شجر تمدن" میں لکھتا ہے:

> "ایک ایسے قادر مطلق کا تصور جس کے کام خواہ کتنے ہی غیر منصفانہ معلوم ہوں مگر وہ مکمل فرمانبرداری اور وفاداری ہی کے ذریعے خوش کیا جا سکتا ہے، براہ راست سامی عائلی نظام کی پیداوار تھا۔ اس عائلی نظام نے مبالغہ آمیز مافوق الفطرت انانیت کو جنم

دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قانون موسوی کی شکل میں انسانی زندگی اور رویہ کے ہر پہلو کے متعلق محرمات کی ایک مفصل فہرست تیار ہوگئی۔ محرمات کا یہ سلسلہ ان لوگوں نے گرہ میں باندھ لیا جو بچپن میں اپنے باپ کے احکام کو یاد رکھنے اور احتیاط سے ان پر عمل کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا تصور مخصوص قسم کے سامی باپ کا پرتو ہے جس کے اختیارات اور اوصاف میں تجرد اور مبالغہ پیدا کر دیا گیا ہے . . . . "

مذہب کے الہامی ماخذ کے انکار پر فرائڈ (FREUD) مطمئن نہ ہوا تو اس نے سرے سے یہ بات ہی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ کسی بنیاد پر بھی مذہبی اعتقادات کے لیے کوئی وجہ جواز نکلتی ہے۔ وہ لکھتا ہے :-

"یہ بات سچی معلوم نہیں ہوتی کہ اس کائنات میں کوئی ایسی طاقت ہے جو ہر فرد کی فلاح و بہبود اور اس کے بہتر انجام کے لیے اس طرح انتظام کرتی ہے جس طرح والدین اپنے بچوں کے لیے احتیاط کرتے ہیں، بلکہ اس کے برعکس آدمیوں کی قسمتیں انصاف کے نام عالمگیر اصولوں سے ٹکرانی ہیں۔ زلزلے، طوفان، سیلاب اور آگ نیک و بد اور مومن و کافر میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ اگر ہم باقی کے بے جان فطری حوادث کو چھوڑ دیں اور صرف انسانوں کے باہمی تعلقات ہی پر نظر دوڑائیں تو یہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ افراد کی تقدیر میں یہ اصول کسی طرح کار فرما نہیں کہ نیکی کا اچھا بدلہ ملتا ہو اور برائی کی سزا دی جاتی ہو۔ اکثر یوں ہوتا ہے کہ بدمعاش اور بے اصول لوگ اس دنیا میں عمدہ چیزیں لے جاتے ہیں اور نیک اور پرہیزگار لوگ خالی ہاتھ منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریک، غیر حساس اور ظالم قسم کی قوتیں انسانی مقدر کا فیصلہ کرتی ہیں اور مذہب کے اس تصور کا یہاں وجود ہی نہیں پایا جاتا کہ دنیا میں خدائی انصاف کی حکومت ہے۔ سائنس کی برتری کم کرنے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کی جائے، مگر اس امر واقعہ سے انکار ممکن نہیں کہ سائنس خارجی دنیا کے حقائق پر ہمارے انحصار کا اندازہ لگاتی ہے جبکہ

مذہب محض ایک بچکانا تصور ہے جس کو صرف اس چیز سے قوت ملتی ہے کہ یہ انسان کی کچھ جبلی خواہشات کا ساتھ دیتا ہے۔"

برٹرینڈرسل (BERTRAND RUSSELL) اس مکمل مادی و ملحدانہ فلسفہ کو مزید ترقی دیتے ہوئے لکھتا ہے:

"یہ حقیقت ہے کہ انسان اُن علتوں کی پیداوار ہے جن کے پیش نظر کسی مقصد کا حصول نہیں تھا۔ یہ سچ ہے کہ بنی نوع انسان کی پیدائش، اس کا ارتقاء، اس کی توقعات اور حسرات اور اس کی محبتیں اور عقیدے ذرات کے اتفاقی عمل کا نتیجہ ہیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ کوئی اولوالعزمی اور فکر و احساس کی کوئی شدت فرد کی زندگی کو قبر کے بعد قائم اور محفوظ نہیں رکھ سکتی۔ یہ حقیقت ہے کہ قرنہا قرن کی ریاضتیں، ساری وفاداریاں اور انسانی تخلیقات و عبقریت کی تمام نوعیتیں وسیع نظام شمسی میں بس جذب ہو کر مٹ جانی ہیں اور وہ اس کے ساتھ ختم ہو جائیں گی۔ یہ امر مسلم ہے کہ انسانی کارناموں کی ساری فلک بوس عمارتیں لامحالہ کائنات کے کھنڈرات میں دب کر رہ جائیں گی۔ یہ ساری چیزیں اتنی یقینی اور حتمی ہیں کہ کوئی فلسفہ ان کا انکار کر کے یہاں ٹھہر نہیں سکتا۔ انہی سچائیوں کے دائرہ کے اندر اور اسی غیر متبدل مایوسی کی مستحکم بنیاد پر انسان کا مسکن بحفاظت بنایا جا سکتا ہے۔"

فرائڈ (FREUD) نے دینی عقائد کو کوئی مثبت قدر و قیمت دینے سے انکار کر دیا مگر اسے یہ تسلیم کرنا پڑا کہ سائنس مذہب کا کوئی اطمینان بخش متبادل نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے:

"اس میں شک نہیں کہ سائنس نے حقیقی دنیا پر زور دیا ہے مگر یہ بھی ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اس کی خصوصیات بھی منفی نوعیت کی ہیں۔ سائنس نے اپنے آپ کو محسوس مادی حقائق تک محدود کر لیا ہے اور خیالات و احساسات سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ ہمارے وہ دوست جو اس صورتِ حالات سے مطمئن نہیں ہیں اور وہ اپنی ذہنی تسکین کے لیے کسی اور چیز کی طلب

رکھتے ہیں، وہ اس چیز کو جہاں پا سکتے ہیں پالیں، ہم بہر حال اس سلسلے میں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے ۔"

شوپن ہاور (SCHOPEN HAUER) نے اس خالص مادی فلسفہ کو اس کے منطقی نتائج تک پہنچا کے چھوڑا۔ اس کے نزدیک اس زندگی کے جوہر و ماحصل کا کوئی مقصد نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ حیات محض ایک بے معنی حرکت اور نہ الصحۃ ایک غیر معقول قوت کا نام ہے۔ وہ لکھتا ہے :-

"چونکہ انسان کی تمام خواہشات کی بنیاد ضرورت، قلت اور تکلیف ہے اس لیے درحقیقت بنیادی طور پر پرندے اور انسان کی فطرت ایک ہی ہے اور اسی فطرت کا ست، دکھ درد اور تکلیف ہے پھر یہ بھی امر واقعہ ہے کہ اگر انسان کی خواہشات ختم کر دی جائیں تو اس کا دل کچھ اتنا بیزار سا ہو جاتا ہے کہ خود زندگی اس کے لیے ناقابل برداشت بوجھ بن جاتی ہے۔ بس یوں سمجھیے کہ زندگی ایک لٹکن (PENDULUM) ہے جو تکلیف سے بیزاری کی طرف اور بیزاری سے تکلیف کی طرف پیہم حرکت کرتا رہتا ہے۔ زندگی چٹانوں اور بھنوروں سے بھرپور سمندر ہے۔ انسان بڑی احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ ان خطرات سے جان بچاتا ہوا چلتا ہے مگر پھر بھی ان تمام کوششوں اور اس ساری مہارت کے باوجود ہوتا یہی ہے کہ وہ ہر ہر قدم اور ہر ہر لحظہ اس سب سے بڑی اور ناگزیر تباہی کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے جسے موت کہتے ہیں۔۔"

یہ ہم نے تحریک احیاء علوم کے دور سے شروع ہونے والے مغربی مادہ پرستانہ فلسفہ کے مآخذ کا کھوج لگایا ہے۔ تحریک احیاء علوم کے زمانے میں لوگ اپنی ذہنی تسکین کی خاطر اپنے اردگرد پھیلی ہوئی وسیع کائنات کے متعلق معلومات حاصل کرتے رہتے تھے، مگر بغیر بریک اور رہنما کے چلی ہوئی اس گاڑی کی آخری منزل شوپن ہار (SCHOPEN HAUER) کی وہ قنوطیت ہے جسے اس زندگی میں سوائے بے مقصد تباہی کے کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ ہم نے دیکھا ہے

کہ ایک زمانے میں انسان اس زمین پر خدا کا خلیفہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کی روح غیر فانی خیال کی جاتی تھی اور اس کے متعلق یہ تصور پایا جاتا تھا کہ وہ ایک اخلاقی و روحانی وجود ہے جو براہِ راست اپنے خالق کے سامنے جوابدہ ہے۔ پھر ہم نے یہ گراوٹ بھی دیکھ لی کہ انسان کو محض ایک جانور سمجھا جانے لگا جس کا مقصد اپنی جسمانی اور معاشرتی ضروریات پوری کرنے کے سوا کچھ نہیں۔

مادہ پرستانہ فلسفہ کا یہ فکری پس منظر ذہن میں ہو تو یہ دیکھ کر کوئی تعجب نہیں ہوتا کہ اس روئے زمین پر فاشزم، نازی ازم، کمیونزم، افادیت پرستی اور صیہونیت جیسے نظریات اور نصب العین اس بے تکلفی اور فراوانی کے ساتھ پھل پھول رہے ہیں۔ وسیع پیمانے پر قتل عام کے انتظام کرنے والے نازی رہنما، اشتراکی روس کی خفیہ پولیس، اشتراکی چین میں عام انسانوں کی زندگیوں کو شکنجوں میں کس دینے والے قائد، اور پوری ایک قوم کو ان کے گھروں سے نکال دینے والے صیہونی لیڈر، ان سب کو نٹشے (NITZSCHE) کے اس نظریے سے تقویت ملی ہے کہ خدا مر چکا ہے۔

اپنی بے پناہ معاشی اور سیاسی قوت کے بل بوتے پر مغربی تہذیب پوری دنیا پر اپنا تسلط جمانے میں کامیاب ہو گئی۔ اس کے بعد جب ایشیائی اور افریقی قومیں نو آبادیاتی نظام سے سیاسی آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئیں تو اس وقت تک ان کی مقامی تہذیبیں اور ثقافتیں پوری طرح سے کچلی جا چکی تھیں۔ ان قوموں کے تقریباً بلا استثنا سارے رہنما یورپین اور امریکی یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل تھے۔ وہ اپنی قومی تہذیب کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ مغربی مادیت کے فلسفہ سے مرعوب اور اس کے نشہ سے سرشار تھے۔ اسی صورتِ حالات کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ایشیا اور افریقہ کے موجودہ قائدین یورپ اور امریکہ کے رہنماؤں کے ساتھ اس فکر میں پوری طرح ہم آہنگ ہیں کہ بھاری صنعتوں کو ترقی دینا، زندگی کا مادی معیار بڑھانا، اور معاشی و سیاسی قوت کو وسعت دینا ہی انسانی معاشرہ کا سب سے اونچا اور اعلیٰ مقصد ہے

ہمیں اسلام کو مغربی فلسفہ کے ساتھ خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ اسلام سماجی اور معاشی بے انصافیوں کی بیخ کنی کے لیے اپنا الگ طریق کار رکھتا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے مادی بہبود کا بس کم سے کم اتنا معیار ضروری ہے کہ جس کے ہوتے ہوئے انسان دلجمعی کے ساتھ اپنے اخلاقی و روحانی تقاضے پورے کر سکے۔ مغربی فلسفہ کے برعکس اسلام میں مادی خوشحالی بذاتِ خود مقصد نہیں بلکہ مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔

اس مادہ پرستانہ پس منظر میں دیکھیں تو اس میں تعجب کی قطعاً کوئی بات نہیں رہ جاتی کہ افریقہ اور ایشیا کے لیڈروں کے لیے مغربی آمریت کی مختلف شکلیں اتنی پُرکشش کیوں ہیں۔ اور وہ مغرب کے سماجی، سیاسی اور معاشی نظام اپنانے کے لیے حد درجہ بیتاب کس لیے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اشتراکی چین کی روزافزوں طاقت کو دیکھ کر عش عش کریں گے، مگر یہ کبھی نہ دیکھیں گے کہ اپنی اس سیاسی اور معاشی برتری کے لیے چین نے کتنے ملین انسان موت کے گھاٹ اتارے ان رہنماؤں کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مقصد حاصل ہونا چاہیے۔ ذریعہ خواہ کچھ ہو۔

ہو سکتا ہے کوئی یہ سوچے کہ مغربی تہذیب کے اس پھیلاؤ سے دنیا میں تمدنی تنوع ختم ہو جائے گا اور اس کے نتیجے میں قوموں میں زیادہ اتحاد اور یگانگت پیدا ہو گی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کی سوچ خواب سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ آج سے پہلے دنیا کی مختلف قوموں کے درمیان کبھی اتنی نفرت، کشمکش، چپقلش اور اکھاڑ پچھاڑ نہیں ہوئی جتنی آج ہے۔ اس کا بالکل واضح سبب یہ ہے کہ مغربی تہذیب کی اٹھان ہی روحانی و اخلاقی قدروں سے بغاوت پر ہوئی ہے۔ جس کا فطری نتیجہ یہ نکلا ہے کہ بین الاقوامی تعلقات میں بھی اخلاقی ذمہ داری کا کوئی شعور نہیں پایا جاتا۔ اقوامِ متحدہ کے اجلاسوں میں مندوبین جھوٹ بولنے اور حسب ضرورت حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے میں ذرہ برابر جھجک محسوس نہیں کرتے۔ دوسرے ملکوں اور قوموں کا کتنا ہی نقصان ہو جائے لیکن جو چیز ان کی اپنی قوم کے لیے نفع بخش ہے وہ کبھی غلط نہیں ہو سکتی۔ اقوامِ متحدہ کے مختلف مسائل پر نمائندے حق کو نہیں بلکہ مصلحت کے پیشِ نظر ووٹ دیتے ہیں۔ نتیجے

اس صورتِ حالات میں یہ کیونکر توقع کی جاسکتی ہے کہ مغربی تہذیب کے پھیلنے سے دنیا میں اتحاد بڑھے گا؟

یہ ہے مغربی تہذیب کی اصلیت اور یہ ہیں اس کے اثرات اور سچی بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں مسلم دنیا کے رہنما کسی اور سے کم خطاکار نہیں۔ وہ بھی مغربی مادہ پرستانہ فلسفوں سے دھوکہ کھائے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کچھ بڑی چکنی چپڑی باتیں کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس وقت اسلام کو دورِ جدید کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لیے وہ یہ تجویز کرتے ہیں کہ قرآن کی روحانی تعلیم اور اس کے معاشرتی نظام کو الگ الگ کر دیا جائے۔ ان کے نزدیک قرآن کا سماجی نظام ساتویں صدی عیسوی کے عرب کے حالات کا پرتو ہے جو اس نئے زمانے میں ناقابلِ عمل ہونے کی وجہ سے متروک قرار دے دینا چاہیے اور بس قرآن کی روحانی تعلیم کو ابدی سچائی سمجھ کر قبول کر لینا چاہیے۔ ان لوگوں کو اس حقیقت کا علم ہی نہیں کہ اسلام ایک مکمل نظامِ زندگی ہے جو مغرب کے تمام افکار، اور نظام ہائے حیات سے کہیں زیادہ برتر ہے۔ وہ یہ جانتے ہی نہیں کہ اس نظام میں سے اگر کچھ لے لیا جائے اور کچھ چھوڑ دیا جائے تو سارا سسٹم تباہ ہو جاتا ہے۔ مسلمان دنیا کے رہنماؤں کو ٹھنڈے دل سے سوچ کر یا پورا مغربی مادہ پرستانہ فلسفہ قبول کر لینا چاہیے یا پورا اسلام۔ وہ دونوں کو ایک ساتھ لے کر نہیں چل سکتے۔

رسائل و مسائل

غلافِ کعبہ کی نمائش اور اس کا جلوس

سوال۔ حال ہی میں بیت اللہ کے غلاف کی تیاری اور نگرانی کا جو شرف پاکستان اور آپ کو ملا ہے وہ باعثِ فخر و سعادت ہے، مگر اس سلسلے میں بعض حلقوں کی جانب سے اعتراضات بھی وارد ہوئے ہیں۔ ان میں سب سے پہلے تو آپ کی نیت پر حملے کیے گئے ہیں اور یہ کہا گیا ہے کہ دراصل آپ اپنے اور اپنی جماعت کے داغ مٹانا اور اپنی پبلسٹی کرنا چاہتے تھے اور آئندہ انتخابات میں کامیابی کے خواہاں تھے، اس لیے آپ نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا تاکہ شہرت بھی حاصل ہو اور الیکشن فنڈ کے لیے لاکھوں روپے بھی فراہم ہوں۔ اس کے بعد بعض اعتراضات اصولی اور دینی رنگ میں پیش کیے گئے ہیں۔ مثلاً یہ کہا گیا ہے کہ :

۱۔ غلافِ کعبہ کو قرآن و حدیث میں شعائر اللہ کے زمرے میں شمار نہیں کیا گیا، اس لیے عملاً یا اعتقاداً اس کی تقدیس و تعظیم ضروری نہیں، یہ بس کپڑے کا ایک ٹکڑا ہے، اس سے زائد کچھ نہیں، خواہ یہ کعبے کی نیت سے بنے یا نہ بنے۔ کعبے سے کسی طرح کا تعلق رکھنے والی اگر ہر شے کا شمار شعائر اللہ میں ہونے لگے اور اس کی تعظیم لازم سمجھی جانے تو پھر تعمیر کعبہ کے لیے جانے والا پتھر یا اس طرح کی دوسری اشیاء بھی قابلِ تعظیم ٹھیریں گی۔

۲۔ غلاف کی نمائش و زیارت اور اسے جلوس کے ساتھ روانہ کرنا ایک بدعت ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلافتِ راشدہ کے دور میں کبھی ایسا نہیں کیا گیا، حالانکہ

غلاف اس زمانے میں بھی چڑھایا جاتا تھا۔ اگر غلاف کی نمائش کرنا اور اس کا جلوس نکالنا جائز ہے تو پھر ہدی کے اونٹوں کا جلوس کیوں نہ نکالا جائے جنہیں قرآن نے صراحت کے ساتھ شعائر اللہ قرار دیا ہے۔

۳۔ جو غلاف ابھی چڑھایا نہ گیا ہو بلکہ چڑھانے کے لیے تیار کیا گیا ہو وہ تو محض کپڑا ہے، آخر وہ کیسے متبرک ہو گیا کہ اس کی زیارت کی اور کرائی جائے اور اسے اہتمام کے ساتھ جلوس کی شکل میں روانہ کیا جائے۔ پھر جو غلاف خانہ کعبہ سے اُترتا ہے اس کی تعظیم و تکریم کیوں روا نہیں رکھی جاتی اور فقہاء نے اس کا عام کپڑے کی طرح استعمال و استفادہ کیوں جائز رکھا ہے۔

۴۔ یہ فعل بجائے خود احداث فی الدین اور بدعت ممنوعہ ہونے کے علاوہ بہت سے دیگر بدعات، منکرات اور حوادث کا موجب ہے۔ چنانچہ غلاف کی اس طرح زیارت اور نمائش کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ مردوں اور عورتوں کا اختلاط ہوا ہے، عورتوں کی بے پردگی اور بے حرمتی ہوئی ہے، جانیں تلف ہوئی ہیں، نذرانے چڑھائے گئے ہیں، غلاف کو چوما گیا ہے، اس کے گرد طواف کیا گیا ہے، اس سے اپنی حاجات طلب کی گئی ہیں حتیٰ کہ اس کو سجدے کیے گئے ہیں۔ پھر غلاف کے جلوس باجے کے ساتھ نکالے گئے ہیں اور اسے حضرت مخدوم علی ہجویری کے مزار پر چڑھایا گیا۔

معترضین کا کہنا یہ بھی ہے کہ ہماری قوم پہلے ہی جذبۂ تنظیم سے عاری اور بدعات میں غرق ہے، اس لیے آپ کو یہ پیشگی سمجھ لینا چاہیے تھا کہ اس طرح کے پروگراموں کا لازمی انجام یہی کچھ ہوگا۔ چنانچہ ان نتائج و عواقب کی ذمہ داری آپ پر براہِ راست عائد ہوتی ہے۔

اس طرح کے اعتراضات چونکہ بار بار اٹھائے جا رہے ہیں۔ اس لیے بہتر اور مناسب ہے کہ آپ ان کا جواب دیں۔ اس ضمن میں یہ بہت ضروری ہے کہ آپ بدعت کے مسئلے کو اصولی طور پر واضح کریں اور بتائیں کہ شریعت میں جو بدعت مکروہ و مذموم ہے اس کی

تعریف کیا ہے اور اس کا اطلاق کس قسم کے افعال پر ہوتا ہے۔

جواب۔ اس معاملہ میں مختلف دینی حلقوں کی طرف سے جو اعتراضات کیے گئے ہیں وہ سب میری نگاہ سے گزرتے رہے ہیں۔ مگر ان میں جو زبان استعمال کی گئی ہے اور جس انداز بیان سے کام لیا گیا ہے، اس کا حریف بننا کسی طرح بھی میرے بس میں نہ تھا، اس لیے میں نے ان سے کوئی تعرض نہ کیا۔ اب ایک سائل نے شرافت و معقولیت کے ساتھ مطالبہ کیا ہے کہ اصل وجوہِ اعتراض پر بحث کی جائے، اس لیے ان صفحات میں اس کا جواب دیا جا رہا ہے۔

جتنے اعتراضات اوپر نقل کیے گئے ہیں، ان کی ساری عمارت دراصل ایک غلط مفروضے پر تعمیر کی گئی ہے۔ معترضین نے اپنی جگہ یہ فرض کر لیا ہے کہ میں نے خود ابتداً کر کے غلاف کی نمائش کا انتظام کیا اور اس کا جلوس نکالنے کا پروگرام بنایا اور اسپیشل ٹرینوں کے ذریعہ سے شہر در شہر اس کو پھرانے کی اسکیم بنائی۔ اسی بنیاد پر وہ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ یہ بدعت آخر یہاں کیوں شروع کی گئی اور پھر اس پر اعتراضات کے ردّے پر ردّے چڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ حالانکہ دراصل یہ مفروضہ ہی بجائے خود واقعات کے خلاف ہے۔ میرے پیشِ نظر سرے سے یہ بات تھی ہی نہیں کہ اس غلاف کے معاملے کو عوام میں مشتہر کیا جائے اور نہ میرے حاشیۂ خیال میں کبھی یہ بات آئی تھی کہ اسے جلوسوں اور نمائشوں کے بعد دھوم دھام سے روانہ کیا جائے۔ غلاف کی تیاری کے لیے ابتداءً سارا کام بالکل رازداری کے ساتھ ہوتا رہا۔ میری خواہش یہ تھی کہ پاکستان کے کاریگروں سے سعودی عرب کے منتظمینِ دارالکسوہ کا براہِ راست معاملہ کرا دوں اور پھر عملاً اس سے بالکل بے تعلق ہو جاؤں۔ میں نہ یہ چاہتا تھا کہ میرا اس کی نگرانی سے کوئی تعلق ہو اور نہ میں نے اس کو پسند کیا کہ اس کی کوئی اطلاع اخبارات میں شائع ہو یا عام لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ میں اس سلسلے میں کوئی کام کر رہا ہوں۔ لیکن صنعت کاریگروں سے سعودی عرب کے منتظمین کا تعارف کرانا اور ان کے کام کے نمونے حاصل کرنا بہرحال ناگزیر تھا۔ اس سے رفتہ رفتہ بات پھیلتی چلی گئی۔ پھر لکایک ایک روز یہ واقعہ پیش آگیا کہ چند کاریگر لسکتے سے آئے ہوئے پرانے غلاف کا ایک ٹکڑا بطورِ نمونہ دیا گیا تھا تاکہ وہ اس کے مطابق کام بنا کر

لائیں عوام کو نہ معلوم کس طرح اُن کے پاس اس ٹکڑے کی موجودگی کا علم ہو گیا اور لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ اس کی زیارت کے لیے جمع ہو گئے۔ اس کے بعد اس کا جلوس بازار میں نکالا گیا اور آناً فاناً یہ بات شہر میں مشہور ہو گئی کہ یہاں غلافِ کعبہ کی تیاری کا کام ہو رہا ہے۔ اس واقعہ سے ایک خبر رساں ایجنسی تک یہ اطلاع پہنچ گئی اور اس نے سارے ملک میں اسے پھیلا دیا۔ پھر اخبارات کے نمائندوں نے بطورِ خود اس میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ غلاف کی تیاری کے مختلف مرحلوں کی اطلاعات اخباری نمائندے خود ہی ٹوہ لگا لگا کر حاصل کرتے رہے اور انہیں شائع کرتے رہے۔ یہاں تک کہ جب غلاف کا کپڑا تیار کرنے کا کام یعقوب انصاری صاحب کے سپرد کیا گیا تو اخبارات نے ان کا فوٹو، ان کے کاریگروں کا فوٹو، ان کی فیکٹری کا فوٹو، تمام تفصیلات کے ساتھ شائع کر دیا، جس سے عوام کو معلوم ہو گیا کہ غلاف کہاں بن رہا ہے اور کون بنا رہا ہے اور غلاف کی تیاری شروع ہونے سے پہلے ہی لوگ فیکٹری پر جمع ہونے لگے۔

یہ سب کچھ میرے علم و اطلاع کے بغیر ہوتا رہا۔ میری کسی خواہش اور کوشش کا اس میں قطعاً کوئی دخل نہ تھا۔

عوام میں جب یہ اطلاعات پھیلیں تو ان کے اندر غلاف کو دیکھنے کا شوق ایک طوفان کی طرح اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے پہلے اس امر کا کوئی اندازہ ہی نہ تھا کہ یہاں لوگ اس چیز سے اتنی اور اتنے بڑے پیمانے پر دلچسپی لیں گے۔ اب جو خلافِ توقع یہ صورت سامنے آئی تو میں نے محسوس کیا کہ اس طوفان کو روک دینا میرے یا کسی شخص کے بس میں نہیں ہے، اور اسے روکنے کی کوشش میں قوت صرف کرنا غیر ضروری بھی ہے، کیونکہ یہ ایک فطری دلچسپی ہے اور نہ بجائے خود ناجائز نہیں ہے۔ یہ ملک عرب سے بہت دُور ہے۔ یہاں کے بہت کم لوگوں کو وہاں جانا اور بیت اللہ کو دیکھنا نصیب ہوتا ہے۔ یہاں کے عوام کو پہلی مرتبہ یہ معلوم ہوا ہے کہ ہمارے ہاں سے ایک ہدیہ خدا کے گھر کے لیے تیار ہو کر جا رہا ہے۔ اس لیے یکایک ان کے اندر آتشِ شوق بھڑک اٹھی ہے۔ یہ شوق کسی بُت کے لیے نہیں ہے۔ کسی معبودِ غیر اللہ کے آستانے کے لیے نہیں ہے۔

خود اللہ رب العالمین کے اپنے گھر کے لیے ہے جسے اللہ نے آپ ہی، مَثَابَةً لِلنَّاسِ بنایا ہے اور تمام آفاق کے لوگوں کو اس کا گرویدہ کیا ہے (فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ)۔ اس شوق کو کسی طرح بھی مشرکانہ نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ بنیادی طور پر یہ ایک خدا پرستانہ شوق ہے اس لیے اسے شوقِ نامحمود قرار دے کر روک دینے اور دبا دینے کی فکر غیر ضروری ہے۔ مگر چونکہ ہمارے عوام دین کے علم اور دینی تربیت سے محروم ہیں اور حدود کو نہیں پہچانتے، اس لیے ایک جائز شوق بھی اگر ان کے اندر سیلاب کی طرح اٹھے اور آپ سے آپ اپنا راستہ نکالنا شروع کر دے تو بہت جلدی وہ غلط راستے پر پڑ سکتا ہے۔ ان سارے پہلوؤں پر غور کر کے میں نے یہ رائے قائم کی کہ عوام کی اس جائز اور فطری دلچسپی کو، جو میرے یا کسی کے بھڑکانے سے نہیں بھڑکی ہے بلکہ آپ سے آپ بھڑک اٹھی ہے، غلط رُخ پر جانے سے روکنے اور صحیح رُخ پر ڈال دینے کی کوشش ناگزیر ہے، اگر میں ایسا نہ کروں گا تو یہ ایسا راستہ اختیار کرے گی جو شرعی اعتبار سے بہت قابلِ اعتراض اور دین و اخلاق کے لیے بہت مضرت رساں ہو گا۔

یہی کچھ سوچ کر میں نے غلاف کی تیاری شروع ہوتے وقت معززینِ شہر کو جمع کیا اور سب کی رضامندی سے مختلف نمائندہ اصحاب کی ایک مجلس بنائی تاکہ وہ شہر کے لوگوں کو غلاف دکھانے اور پھر احترام کے ساتھ اسے روانہ کرنے کے ایسے انتظامات کرے جن سے لوگوں کے جذبۂ شوق کی تسکین جائز حدود کے اندر ہو جائے اور بے قاعدہ زیارتوں اور جلوسوں کی نوبت نہ آنے پائے۔ اس مجلس میں حسبِ ذیل اصحاب شامل کیے گئے:

۱۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب (مولانا مفتی محمد حسن صاحب مرحوم و مغفور کے صاحبزادے اور جامعہ اشرفیہ کے نائب مہتمم، علمائے دیوبند کے گروہ سے)

۲۔ مفتی محمد حسین نعیمی صاحب (مہتمم جامعہ نعیمیہ، بریلوی گروہ کے علماء میں سے)

۳۔ مولانا حافظ کفایت حسین صاحب (شیعہ علماء میں سے)

۴۔ حاجی محمد اسحاق حنیف صاحب (ناظم نشر و اشاعت جمعیت اہل حدیث سان کا نام

اس مجلس کی رکنیت کے لیے جناب مدیر الاعتصام نے خود تجویز کیا تھا)

۵۔ چودھری محمد حسین صاحب (وائس چیئرمین لاہور کارپوریشن)

۶۔ چودھری محمد امین صاحب (کونسلر لاہور کارپوریشن)

۷۔ محمد عمر خاں صاحب بسمل (ہیڈ ماسٹرز ایسوسی ایشن، لاہور)

۸۔ نصراللہ شیخ صاحب (صدر پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین)

۹۔ حاجی محمد لطیف صاحب (صدر شاہ عالم مارکیٹ)

۱۰۔ شیخ تاج دین صاحب (صدر اعظم کلاتھ مارکیٹ ایسوسی ایشن)

۱۱۔ حاجی معراج دین صاحب (چیئرمین یونین کونسل شو مارکیٹ)

۱۲۔ ملک مبارک علی صاحب (چیئرمین یونین کمیٹی چوک وزیر خاں)

۱۳۔ شمشیر علی صاحب (لیڈیز اوڈن ہاؤس، انارکلی)

۱۴۔ شیخ فرحت علی صاحب (فرحت علی جیولرز، مال روڈ)

۱۵۔ سیٹھ ولی بھائی صاحب (بمبئی کلاتھ ہاؤس، انارکلی)

۱۶۔ رانا اللہ داد خاں صاحب (رانا موٹرز، مال روڈ)

۱۷۔ عزیز الرحمٰن صاحب (سائنس ہاؤس، میکلیگن روڈ)

۱۸۔ جناب کوثر نیازی صاحب (ایڈیٹر شہاب)

اس پوری مجلس میں جماعت اسلامی کے صرف دو رکن شامل تھے باقی سب مختلف گروہوں کے نمائندہ اور ذمہ دار اصحاب تھے۔ میں نے خود اپنے آپ کو اس میں سرے سے شامل ہی نہ کیا تھا۔ البتہ اس کے دو اجلاسوں میں ارکانِ مجلس کی خواہش پر شریک ضرور ہوا تھا۔ ان مواقع پر ڈپٹی کمشنر لاہور، [illegible] لاہور، اور سٹی مجسٹریٹ لاہور بھی شریکِ اجلاس تھے۔ سب کے مشورے سے یہ پروگرام بنایا گیا کہ خلافت روانہ کرنے سے پہلے چار دن عورتوں کو اور تین دن مردوں کو اس کے دیکھنے کا موقع دیا جائے۔ اس نمائش میں عورتوں اور مردوں کو ہرگز خلط ملط نہ ہونے دیا جائے۔ نمائش گاہ

میں ایسے کارکن (عورتوں کے لیے عورتیں اور مردوں کے لیے مرد) مقرر کیے جائیں جو لوگوں کو جائز شرعی حدود کی تلقین کرتے رہیں اور ناجائز افعال سے روکیں۔ نذرانے دینے سے بھی لوگوں کو منع کیا جائے اور انہیں ہدایت کی جائے کہ غلاف کو دیکھتے وقت بس اللہ کا ذکر کریں، کلمہ طیبہ اور درود پڑھیں، اور اللہ سے دعا کریں کہ اپنے اُس گھر کی زیارت کا بھی شرف عطا فرمائے جس کا غلاف دیکھنے کی توفیق اس نے بخشی ہے۔ پھر غلاف روانہ کرتے وقت اسے جلوس کی شکل میں لے جایا جائے۔ (کیونکہ جلوس نکالا نہ گیا تو وہ خود نکل کر رہے گا اور بری طرح نکلے گا)۔ مگر اس امر کا پورا اہتمام کیا جائے کہ جلوس کے پورے راستے سے فحش تصویریں ہٹا دی جائیں۔ گانوں کی ریکارڈنگ بند کر دی جائے۔ تکبیر و تہلیل اور اللہ جل شانہ کی حمد کا غلغلہ اس زور سے بلند کیا جائے کہ سارا شہر اس سے گونج اٹھے۔ اور اس جلوس میں عورتوں کو شریک ہونے سے منع کیا جائے۔

یہ تھا وہ پروگرام جو شہر لاہور کے لیے بنایا گیا تھا۔ اس کے بعد ہمیں ایک اور صورت حال سے سابقہ پیش آیا۔ وہ یہ تھی کہ غلاف کو دیکھنے کی تڑپ صرف لاہور شہر تک محدود نہ تھی بلکہ جگہ جگہ سے لوگ آکر اسے فیکٹری ہی میں دیکھ رہے تھے اور فیکٹری والوں کے لیے کام کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ پھر لوگوں نے کسی نہ کسی طرح فیکٹری والوں سے غلاف کے تھان حاصل کرنے شروع کر دیئے اور مختلف شہروں میں جاکر ان کے جلوس نکالے اور اپنے اپنے طریقوں پر ان کی زیارت کرائی۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ جس خرابی کو میں یہاں روکنا چاہتا ہوں وہ پورے ملک میں پھیلے گی۔ یہ خطرہ بھی لاحق ہوا کہ اس طرح کہیں کچھ تھان ضائع نہ ہو جائیں۔ اس لیے میں نے ضروری سمجھا کہ باہر کے لوگوں کو بھی غلاف دکھانے کا باقاعدہ انتظام کر دیا جائے۔ چنانچہ پاکستان ویسٹرن ریلوے کے تعاون سے دو اسپیشل ٹرینوں کا انتظام کیا گیا۔ ان کے ساتھ بارہ بارہ ریلوے اسکاؤٹس، تین تین سول ڈیفنس کے رضاکار، اور تین تین جماعت اسلامی کے کارکن بھیجے گئے۔ ان میں لاؤڈ اسپیکر نصب کیے گئے۔ اور کارکنوں کو یہ ہدایات دی گئیں کہ جہاں بھی وہ لوگوں کو غلاف دکھانے کے لیے ٹھیریں وہاں پہنچتے ہی اللہ کے ذکر کا غلغلہ اس زور سے بلند کریں کہ کوئی دوسرا نعرہ اٹھنے ہی نہ پائے۔ زائرین کو ہر طرح کے مشرکانہ افعال سے روکیں۔ عورتوں اور

مردوں کو غلط ملط نہ ہونے دیں۔ نذرانے ڈالنے سے منع کریں تنظیم کے ساتھ غلاف دکھائیں تاکہ حادثات رونما نہ ہوں۔ اور لوگوں کو سمجھائیں کہ یہ صرف ایک کپڑا ہے جو اللہ کے گھر کے لیے بنایا گیا ہے۔ اسے بس دیکھ لو اور اللہ سے دعا کرو کہ وہ اپنے گھر کی زیارت بھی نصیب کرے۔

واقعات کی اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ کوئی ایسا پروگرام نہ تھا جو میں نے خود کسی اچھے یا بُرے مقصد سے شروع کیا ہو۔ بلکہ یہ پروگرام اُس وقت بنایا گیا جب عوام میں ایک جذبہ خود بخود بھڑک اٹھا تھا، اور اس کے بنانے کی اصل غرض یہ تھی کہ اس جذبے کے سیلاب کو منکرات کی طرف جانے اور صحیح راستے پر موڑنے کے لیے جو کچھ کیا جا سکتا ہے، کیا جائے۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو یہ بہت زیادہ مکروہ راستہ اختیار کر لیتا اور کسی کے روکے نہ رُکتا۔

اب آگے بڑھنے سے پہلے میں مختصراً یہ بھی بتائے دیتا ہوں کہ فی الواقع ہُوا کیا ہے اور اس کو بنا کیا دیا گیا ہے۔

لاہور شہر میں مجلسِ انتظامیہ کے زیرِ اہتمام غلاف کی نمائش چار دن عورتوں کے لیے اور تین دن مردوں کے لیے رہی اور ایک ایک دن مردوں اور عورتوں کے لیے علیٰحدہ علیٰحدہ نمائش کا انتظام لاہور چھاؤنی میں بھی کیا گیا۔ ان مواقع پر غلاف کو سجدہ کرنے، یا اس کا طواف کرنے کا کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔ کارکنوں نے لوگوں کو حدودِ شرعیہ سمجھانے اور ان کی خلاف ورزی سے روکنے کی پوری کوشش کی۔ کسی قسم کے نذرانے اور چڑھاوے نہ چڑھانے دیئے گئے۔ بہت بڑی اکثریت نے کارکنوں کی تلقین کو قبول کیا اور حدود کی پابندی کی۔ لیکن جہاں ہزاروں لاکھوں آدمی ٹوٹ پڑے ہوں وہاں یہ ممکن نہ تھا کہ کسی شخص کو بھی حد سے تجاوز نہ کرنے دیا جائے۔ اس سیلاب میں اگر کچھ لوگ منع کرنے کے باوجود غلاف کو چوم بیٹھے، یا کوئی بندۂ خدا غلاف ہی سے دعا مانگ بیٹھا یا مردوں کی نمائش میں کچھ عورتیں خود اپنے گھر والوں کے ساتھ آگئیں تو اس کی ذمہ داری آخر منتظمین پر کیسے عائد ہو جائے گی۔

لاہور کا جلوس میں نے خود دیکھا ہے اور شروع سے آخر تک اس میں شریک رہا ہوں۔ ہوائی اڈے تک پہنچتے پہنچتے اس میں ۷ لاکھ آدمی شامل ہو گئے تھے اور آٹھ میل لمبا راستہ تھا۔ اس پورے

راستے میں تمام سینماؤں اور دوکانوں پر سے عورتوں کی تصاویر اور ہر قسم کی فحش تصویریں ہٹادی گئی تھیں یا چھپادی گئی تھیں۔ ریڈیو پر گانوں کی تمام آوازیں بند ہوگئی تھیں۔ پورا جلوس اللہ اکبر اور لا الٰہ الا اللہ کے ذکر کے سوا کوئی چیز قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اتنے بڑے ہجوم میں ایک جیب نہیں کٹی۔ کسی نے سگریٹ نہیں پیا۔ کوئی غنڈہ گردی کا واقعہ پیش نہیں آیا۔ عورتیں منع کرنے کے باوجود آئیں، مگر کوئی ادنیٰ سا واقعہ بھی عورتوں کو چھیڑنے کا سننے میں نہ آیا[1]۔ پورے شہر پر اُس وقت نیکی کا اتنا غلبہ تھا کہ بعض لوگ جن کی جوتیاں مال روڈ پر جلوس میں چھوٹ گئی تھیں انہوں نے کئی گھنٹے بعد ہوائی اڈے سے واپس آکر اپنی جوتیاں اسی جگہ پڑی پائیں جہاں وہ چھوٹی تھیں۔ اتنی بڑی خیر میں اگر کہیں کوئی مشرکانہ یا مبتدعانہ بات ہوگئی تو وہ معترضین کی گرفت میں آگئی۔ حالانکہ جہاں لاکھوں آدمی جمع ہوں وہاں کون اس امر کی ضمانت لے سکتا تھا کہ کوئی فرد بھی کوئی غلط کام نہ کرے گا۔ چلتے ہوئے مجمع میں اگر کچھ لوگ لپک کر غلاف کو چوم بیٹھے، یا کچھ لوگوں نے غلط نعرے لگا دیئے، یا اور کوئی بے جا بات کرگزرے تو کیا صرف اس وجہ سے اُس خیرِ عظیم پر پانی پھیر دیا جائے گا جو اتنے بڑے پیمانے پر اس روز شہر لاہور میں رونما ہوئی ہے؟ یہ تو مکھی کا سا حال ہوا کہ ساری پاک چیزوں کو چھوڑ کر وہ صرف گندگی ہی تلاش کرتی ہے اور کہیں اس کی کوئی چھینٹ پا جائے تو اسی پر جا بیٹھتی ہے۔

جو اسپیشل ٹرینیں باہر بھیجی گئی تھیں ان کی مفصل رپورٹ بھی میں نے لی ہے اور صرف جماعتِ اسلامی کے کارکنوں ہی سے نہیں بلکہ سول ڈیفنس اور ریلوے اسکاؤٹس کے اُن لوگوں سے بھی لی ہے جو ان ٹرینوں کے ساتھ گئے تھے[2]۔ ان کا متفقہ بیان ہے کہ جگہ جگہ ہزاروں، بلکہ بعض جگہ لاکھوں آدمی غلاف دیکھنے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ ہر جگہ ذکر اللہ ہی غالب رہا اور بہت کم دوسرے نعرے بلند ہو سکے۔ ہر جگہ عورتوں اور مردوں کے مجمعے الگ رہے اور بہت ہی کم مقامات پر

[1] مجھ سے لاہور شہر کے ڈی ایس پی شیخ اسرار احمد صاحب نے خود بیان کیا کہ اس جلوس میں جیب تراشی، غنڈہ گردی اور عورتوں کو چھیڑنے کا کوئی واقعہ ان کے نوٹس میں نہیں آیا ہے۔

[2] اس رپورٹ کا خلاصہ "ایشیا" اور "شہاب" میں شائع ہو چکا ہے۔ میرے پیشِ نظر صرف وہ تحریری خلاصہ ہی نہیں ہے بلکہ وہ بیانات بھی ہیں جو ان لوگوں نے فرداً فرداً میرے سامنے زبانی پیش کیے۔

ہجوم کی کثرت کے باعث انہیں خلط ملط ہونے سے نہ روکا جا سکا۔ ہر جگہ امن و سکون سے زیارت ہوئی اور بہت کم مقامات پر حادثات پیش آئے جن کی وجہ کسی کی غفلت نہ تھی بلکہ ازدحام کی شدت تھی۔ عورتیں کثرت سے آئیں، مگر شاذ و نادر ہی کہیں یہ واقعہ پیش آیا کہ کسی نے انہیں چھیڑا ہو۔ اتنے بڑے مجمعوں میں کسی کی جیب کٹنے کا کوئی واقعہ سننے میں نہیں آیا۔ عوام کو بڑے پیمانے پر نیکی اور بھلائی کی تلقین کی گئی اور انہیں غلاف کی زیارت کے حدود سمجھائے گئے۔ عموماً لوگوں نے ان حدود کا لحاظ رکھا اور زیادہ تر لوگ یہی دعا مانگتے دیکھے گئے کہ خدایا، جس گھر کا غلاف تو نے دکھایا ہے خود اس گھر کو بھی دیکھنے کی توفیق عطا فرما۔ ان ٹرینوں کے ساتھ جو غلاف گئے تھے ان میں سے کسی کا طواف ہرگز نہیں ہوا، اور نہ کسی کو غلاف کے آگے سجدہ کرتے دیکھا گیا۔ اب اگر کہیں ان لاکھوں انسانوں کے مجمع میں کوئی غلاف کو، یا غلاف لے جانے والی ٹرین کو چوم بیٹھا، یا کسی نے ٹرین کے انجن کو انجن شریف کہہ دیا، یا کارکنوں کے منع کرنے کے باوجود لوگوں نے ٹرین کے اندر پیسے پھینک دیئے، یا ہجوم کی کثرت کے باعث عورتوں اور مردوں کو خلط ملط ہونے سے نہ روکا جا سکا تو بس یہی چند واقعات ہمارے دین داروں نے اعتراض جڑنے کے لیے چن لیے اور اس ساری خیر کو نظر انداز کر دیا جو اس کام میں غالب پائی جاتی تھی۔

پھر ان معترض حضرات نے محض کیڑے چننے ہی پر اکتفا نہ کیا بلکہ جہاں کیڑے نہ تھے وہاں اپنی طرف سے کیڑے ڈالنے میں بھی تامل نہ فرمایا۔ مثلاً لاہور میں مجلس انتظامیہ کے علم و اجازت کے بغیر اس محلے کے لوگوں نے، جس میں غلاف تیار کرنے والی فیکٹری قائم تھی، بطور خود غلاف کا جلوس نکال ڈالا تھا۔ اس جلوس کے متعلق بڑے بڑے اتقیاء و صلحاء یہ الزام لگا رہے ہیں کہ اس کے آگے باجا بج رہا تھا، اور جلوس والوں نے غلاف کو لے جا کر حضرت علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر چڑھا دیا۔ حالانکہ یہ دوسری بات تو قطعی جھوٹ ہے۔ غلاف کو مزار پر چڑھانے کی روایت سرے سے کوئی اصلیت نہیں رکھتی۔ رہا باجا، تو اس کے متعلق خبریں متضاد ہیں۔ کسی کا بیان ہے کہ بجا تھا، کسی کا کہنا ہے کہ نہیں بجا۔ اور کوئی کہتا ہے کہ جب جلوس گزر رہا تھا تو ایک برات آ گئی جس کے ساتھ باجا تھا۔ تاہم

اگر وہ بجا بھی ہو تب بھی اس کی کوئی ذمہ داری مجھ پر یا مجلسِ انتظامیہ پر عائد نہیں ہوتی کیونکہ جلوس ہماری اجازت کے بغیر، بلکہ ہمارے منع کرنے کے باوجود نکالا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہم کسی طرح بھی غلاف کو اُن لوگوں سے نہ بچا سکتے تھے جن کے محلّے میں وہ بن رہا تھا۔ الّا یہ کہ ایک ہیلی کاپٹر فراہم کیا جاتا اور غلاف کے تھان وہاں سے اُڑا کر نکالے جاتے۔

عجیب تر بات یہ ہے کہ ان حضرات کو سارا غم صرف اُس غلاف کا ہے جو لاہور میں تیار ہوا تھا۔ کراچی میں جو غلاف بنا تھا، نمائش اس کی بھی ہوئی، اور شہر در شہر وہ بھی پھرا، مگر اس کا ماتم کسی سے نہ سُنا گیا۔ بلکہ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا، وہ سب بھی ایسے سیاق و سباق میں بیان کیا گیا کہ وہ آپ سے آپ میرے اور جماعت اسلامی کے حساب میں پڑ گیا۔

یہ باتیں تو پھر بھی ظاہر سے تعلق رکھتی تھیں۔ کمال یہ ہے کہ ہمارے ان دین داروں کی نگاہِ دُور رس میرے باطن تک بھی جا پہنچی اور انہیں معلوم ہو گیا کہ میں نے غلافِ کعبہ کی نمائش کا یہ سارا اہتمام کس نیّت سے کیا تھا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ میری نیت ان پر کیسے منکشف ہو گئی۔ اگر وہ علیمٌ بذات الصدور ہونے کے مدعی ہیں تو یہ اُس شرک و بدعت سے اشد چیز ہے جس پر وہ گرفت فرما رہے ہیں۔ اور اگر انہوں نے میری طرف یہ نیت محض قیاس و گمان کی بنا پر منسوب فرمائی ہے تو شاید انہیں قرآن و حدیث میں صرف شرک و بدعت ہی کی بُرائی ملی ہو گی، بہتان و افترا کے متعلق احکام ان کی نگاہ سے نہ گزرے ہوں گے۔

اس بیانِ واقعہ کے بعد اب میں اُن اصولی سوالات کی طرف رجوع کرتا ہوں جن پر روشنی ڈالنے کی خواہش محترم سائل نے ظاہر فرمائی ہے۔

۱۔ شعائر اللہ کے لفظ کا اطلاق صرف انہی چیزوں پر نہیں ہوتا جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ لفظ استعمال فرمایا ہے، بلکہ ہر وہ چیز جو خدا پرستی کی علامت ہو، شعائر اللہ میں شمار کی جا سکتی ہے۔ اور جس چیز کو بھی اللہ جلّ شانہٗ کے حضور ہدیہ کرنے کی نیت کر لی جائے اس کا احترام بجا و درست ہے۔ یہ احترام اُس شے کا نہیں بلکہ اس خدا کا ہے جس کے لیے اسے مخصوص کرنے کی

نیت کی گئی ہے۔ خانۂ کعبہ کی تعمیر کے لیے اگر پتھر اور لکڑی بھی جمع کی جائے، اور لوگ اسے ادب و احترام کے ساتھ اٹھائیں اور اُسے اٹھاتے اور لے جاتے اور تعمیر کی خدمت انجام دیتے وقت باوضو ہونے اور اللہ کا ذکر کرنے کا اہتمام کریں، تو آخر یہ چیز قابلِ اعتراض کس بنیاد پر ہو گی؟ البتہ جو شخص ان حدود سے تجاوز کر کے انہی چیزوں کا طواف، یا ان کی طرف رُخ کر کے سجدہ کرنے لگے یا ان سے دعا و استعانت کرنے لگے تو یہ بلاشبہ شرک ہو گا۔

۲۔ کسی فعل کو بدعتِ مذمومہ قرار دینے کے لیے صرف یہی بات کافی نہیں ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نہ ہُوا تھا۔ لغت کے اعتبار سے تو ضرور ہر نیا کام بدعت ہے۔ مگر شریعت کی اصطلاح میں جس بدعت کو ضلالت قرار دیا گیا ہے اس سے مراد وہ نیا کام ہے جس کے لیے شرع میں کوئی دلیل نہ ہو، جو شریعت کے کسی قاعدے یا حکم سے متصادم ہو، جس سے کوئی ایسا فائدہ حاصل کرنا یا کوئی ایسی مضرت دفع کرنا متصور نہ ہو جس کا شریعت میں اعتبار کیا گیا ہے، جس کا نکالنے والا اسے خود اپنے اوپر یا دوسروں پر اس اعتقاد کے ساتھ لازم کرے کہ اس کا التزام نہ کرنا گناہ اور کرنا فرض ہے۔ یہ صورت اگر نہ ہو تو مجرد اس دلیل کی بنا پر کہ فلاں کام حضورؐ کے زمانے میں نہیں ہُوا، اسے "بدعت" بمعنی ضلالت نہیں کہا جا سکتا۔ بخاری نے کتاب الجمعہ میں چار حدیثیں نقل کی ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ عہدِ رسالت اور عہدِ شیخین میں جمعہ کی صرف ایک اذان ہوتی تھی، حضرت عثمان نے اپنے دور میں ایک اذان کا اور اضافہ کر دیا۔ لیکن اسے بدعتِ ضلالت کسی نے بھی قرار نہیں دیا بلکہ تمام امت نے اس نئی بات کو قبول کر لیا۔ بخلاف اس کے انہی حضرتِ عثمان نے منیٰ میں قصر کرنے کے بجائے پُوری نماز پڑھی تو اس پر اعتراض کیا گیا۔ حضرت عبداللہ بن عمر صلوٰۃ ضحیٰ کے لیے خود بدعت اور احداث کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ انھا لمن احسن ما احدثوا (یہ ان بہترین نئے کاموں میں سے ہے جو لوگوں نے نکال لیے ہیں)، بدعۃ و نعمت البدعۃ (بدعت ہے اور اچھی بدعت ہے)، ما احدث الناس شیئاً احب الیّ منہا (لوگوں نے کوئی ایسا نیا کام نہیں کیا ہے جو مجھے اس سے

زیادہ پسند ہو)۔ حضرت عمرؓ نے تراویح کے بارے میں وہ طریقہ جاری کیا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں نہ تھا۔ وہ خود اسے نیا کام کہتے ہیں اور پھر فرماتے ہیں نعمت البدعۃ ھذہٖ (یہ اچھا نیا کام ہے)۔ اس سے معلوم ہوا کہ مجرّد نیا کام ہونے سے کوئی فعل بدعتِ مذمومہ نہیں بن جاتا بلکہ اسے بدعت مذمومہ بنانے کے لیے کچھ شرائط ہیں۔

امام نووی شرح مسلم (کتاب الجمعہ) میں کل بدعۃ ضلالۃ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "علماء نے کہا ہے کہ بدعت (یعنی باعتبارِ لغت نئے کام) کی پانچ قسمیں ہیں۔ ایک بدعت واجب ہے دوسری بدعت مندوب ہے (یعنی پسندیدہ ہے جسے کرنا شریعت میں مطلوب ہے)، تیسری بدعت حرام ہے، چوتھی مکروہ ہے، اور پانچویں مباح ہے . . . اور ہمارے اس قول کی تائید حضرت عمرؓ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے جو انہوں نے نماز تراویح کے بارے میں فرمایا۔"

علامہ عینی عمدۃ القاری (کتاب الجمعہ) میں عبد بن حمید کی یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ "جب مدینہ کی آبادی بڑھ گئی اور دُور دُور مکان بن گئے تو حضرت عثمانؓ نے تیسری اذان کا (یعنی اس اذان کا جو اب جمعہ کے روز سب سے پہلے دی جاتی ہے) حکم دیا اور اس پر کسی نے اعتراض نہ کیا، مگر منیٰ میں پوری نماز پڑھنے پر اعتراض کیا گیا۔"

علامہ ابن حجر فتح الباری (کتاب التراویح) میں حضرت عمر کے قول نعمت البدعۃ ھذہٖ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "بدعت ہر اس نئے کام کو کہتے ہیں جو کسی مثالِ سابق کے بغیر کیا گیا ہو۔ مگر شریعت میں یہ لفظ سنّت کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے اور اسی بنا پر بدعت کو مذموم کہا جاتا ہے۔ اور تحقیق یہ ہے کہ جو نیا کام شرعاً مستحسن کی تعریف میں آتا ہو وہ اچھا ہے، اور جو شرعاً بُرے کام کی تعریف میں آتا ہو وہ بُرا ہے، ورنہ پھر مباح کی قسم میں سے ہے۔"

اس اصولی وضاحت کے بعد اب میں عرض کرتا ہوں کہ غلاف کے کپڑے کا جلوس نکالنا اور اس کی نمائش کا انتظام کرنا بلاشبہ ایک نیا کام تھا جو عہدِ رسالت اور زمانۂ خلافتِ راشدہ میں نہیں ہوا۔ مگر میں نے یہ کام اس بنا پر نہیں کیا کہ میں اصلاً اس کی نمائش کرنا چاہتا تھا اور اسے دھوم دھام

کے ساتھ بھیجنا ابتدا ہی سے میری اسکیم میں شامل تھا۔ بلکہ میں نے یہ پروگرام اُس وقت بنایا جب سارے ملک میں اُس کے لیے عوام کے اندر بے پناہ جذبۂ شوق خود بخود بھڑک اٹھا اور مجھے اندیشہ ہوا کہ یہ شوق اگر خود اپنا راستہ نکالے گا تو بڑے پیمانے پر گمراہی پھیلنے کا موجب بن جائے گا۔ (چنانچہ جہاں جہاں بھی اس نے موقع پاکر خود اپنا راستہ نکالا، بہت بُری طرح نکالا) اس لیے میں نے اُس مضرت کو دفع کرنے کی خاطر یہ کام کیا جو شریعت کی نگاہ میں ایک بڑی مضرت تھی۔ اس کے لیے ایسا طریقہ تجویز کیا جس سے لوگوں کے جذبات کا سیلاب حدودِ شرع کے اندر محدود رہ سکے۔ اس کو سیئات کے بجائے اُن حسنات کی طرف موڑنے کی کوشش کی جو شرعاً پسندیدہ ہیں۔ میرا ہرگز یہ دعویٰ نہ تھا کہ لوگوں کو ضرور غلاف دیکھنا اور اس کے جلوس میں شامل ہونا چاہیے، نہ آئیں گے تو گناہ گار ہوں گے، اور آئیں گے تو یہ اور یہ اجر ملے گا۔ اور میرا یہ ارادہ بھی نہیں ہے کہ آئندہ اگر پاکستان ہی میں غلاف بننے لگے اور اس سے میرا کوئی تعلق ہو تو میں اس کی زیارت کے اہتمام اور جلوسوں کے انتظام کو ایک مستقل طریقہ بنالوں۔ اب میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کس فقہی قاعدے سے میں بدعتِ ضلالت کا مرتکب ہوتا ہوں۔ اگر سبّ وشتم کے بجائے کوئی صاحب دلائل سے مجھے بتادیں کہ پھر بھی یہ بدعتِ ضلالت ہی ہے تو مجھے نادم اور تائب ہونے میں ذرہ برابر تامل نہ ہوگا۔ الحمدللہ، میں متکبر نہیں ہوں کہ گناہ کو گناہ جان لینے کے بعد بھی محض اپنی بات کی پچ میں اس پر اصرار کروں۔

۴۔ کوئی کپڑا خواہ کعبے پر چڑھایا گیا ہو، یا چڑھانے کے لیے تیار کیا گیا ہو، دونوں صورتوں میں وہ ایسا متبرک نہیں ہوجاتا کہ اس سے برکت حاصل کرنے کے لیے اس کو چھوا جائے، چوما جائے، اس کی زیارت کی اور کرائی جائے، اور اسے دھوم دھام سے روانہ کیا جائے۔ بلکہ فقہاء نے کعبے پر سے اُترے ہوئے غلاف سے بھی لباس بنانے کو جائز قرار دیا ہے، بشرطیکہ اس پر کلمہ طیبہ، یا آیاتِ قرآنی، یا اسماء الٰہی لکھے ہوئے نہ ہوں۔ لیکن اگر لوگ اس بنا پر اُس کا از خود (نہ کہ کسی شرعی حکم اور فتوے کی حیثیت سے) احترام کریں کہ یہ اللہ کے گھر کے لیے جا رہا ہے، یا وہاں سے اُتر کر آیا ہے، تو اس احترام کو ناروا بھی نہیں کہا جا سکتا۔ یہ تو اُس نسبت کا احترام ہے جو اسے اللہ کے گھر سے حاصل ہوگئی ہے۔ اس احترام کے

لیے اللہ کی عظمت و محبت کے سوا کوئی دوسرا محرک نہیں ہے۔ اس احترام کو کوئی شخص واجب اور اس کی کسی خاص شکل کو لازم قرار دے تو غلط ہے۔ لیکن کوئی اسے مذموم ٹھیرائے اور خواہ مخواہ شرک قرار دے تو یہ بھی زیادتی ہے۔ رہی اس کی زیارت اور اس کے لیے جلوس کا اہتمام، تو وہ جس بنا پر کیا گیا اس کی وضاحت میں اوپر کر چکا ہوں۔

تعارفِ کُتب

آرٹ انسانی فطرت کی ایک پیدائشی امنگ ہے جسے خود خالقِ کائنات نے اپنے ہر کام میں ملحوظ رکھا ہے۔ اس لیے بجائے خود اس کے ناجائز یا ممنوع ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس فطری امنگ نے اظہار کے جو جامے مغربی قوموں نے اختیار کیے ہوں اُن کے علاوہ کوئی دوسرا جامہ موزوں ہی نہیں ہو سکتا۔ مغربی اقوام کی نقالی میں ہم یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ آرٹ صرف ناچ، گانے، مصوری اور سنگ تراشی ہی میں منعکس ہوتا ہے اور ان کے دائرے سے باہر اس کا وجود عنقا ہے۔

دنیا کی ہر قوم اپنے مخصوص مزاج، اپنے تصورات و اعتقادات، اپنے معاشرتی حالات کے مطابق آرٹ کے مختلف جامے تراشتی ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ اس کرۂ ارضی پر آج تک جتنی قوموں نے مادہ پرستی کو اپنی زندگی کا شعار بنایا اُن کے آرٹ میں "حسی لذتیت" ہمیشہ ایک غالب عنصر کی حیثیت سے شامل رہی۔

اسی موضوع پر دُنیا کے ایک مشہور ڈاکٹر برن ہارڈ اے۔ بار (Dr. BERNHARD A-BAUER) جو نسوانی امراض کا ماہر ہے، ایک نہایت دلچسپ کتاب بعنوان "خاتون اور محبت" (WOMAN AND LOVE) لکھی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۹ء میں نیویارک سے شائع ہوئی تھی۔ اس میں فاضل مصنف نے بڑی دیدہ وری سے عورت کے دل و دماغ اور اعصاب پر ناچ اور گانے کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ وہ گانے کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"گانا عورت کے اندر عشق کے جذبات کو بھڑکاتا ہے گویا خواہ وہ صاحبِ فن نہ

بھی ہو، لیکن اگر وہ حسین ہے تو عورت اُس سے لازمی طور پر متاثر ہوتی ہے اور خصوصاً جب اُس کے نغموں میں عشق کی کلفتوں اور مسرتوں کا بیان ہو تو اُس کا سحر ناقابلِ بیان ہوتا ہے۔ ایک عورت جب آنکھیں بند کر کے، دل و دماغ کی یکسوئی کے ساتھ پُرسوز نغموں کو سنتی ہے تو اُسے یہ احساس نہیں ہوتا کہ اُس کی نبض کی حرکت عشق کے جذبہ کی وجہ سے تیز ہو رہی ہے اور اس میں گانے والے کا حسن و جمال بھی خود نغمہ بن کر اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر رہا ہے"

"بہت سے اچھے گھرانوں کی عورتیں جو کبھی بڑے عزت و احترام کے ساتھ اپنے خاندان میں مسرت اور شادمانی کی زندگی بسر کر رہی تھیں، انہوں نے گویوں کے عشق میں اپنے خاوندوں اور اولاد کو الوداع کہا"

ڈاکٹر بارساز کے نفسیاتی پہلوؤں کا ذکر کرتے ہوئے بڑے واشگاف الفاظ میں کہتا ہے:

"ساز" گانے کے بغیر بھی مرد اور عورت کے قلبی سکون کو جس طرح غارت کرتا ہے اُس کا عام لوگوں کو بہت کم احساس ہوتا ہے۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اس سے انسان کے حسی جذبات میں تلاطم برپا ہو جاتا ہے اور خاص طور پر اُس کے صنفی میلانات میں تو شدید طوفان اٹھنے لگتے ہیں۔ مرد اور عورت دونوں ہی متاثر ہوتے ہیں لیکن اس کے اثرات کا جب میں نے ذرا گہرائی میں اتر کر جائزہ لیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس کا اثر صنف نازک پر زیادہ تیز، شدید اور دیرپا ہوتا ہے"

ڈاکٹر بار نے اسی تصنیف میں "ناچ" پر بھی بڑی ہی فکر انگیز بحث کی ہے۔ اس ضمن میں اُس نے سب سے پہلے اس سوال کو اٹھایا ہے کہ انسان آغاز ہی سے اس کا کیوں اتنا دلدادہ چلا آ رہا ہے۔ اس کا جواب وہ یہ دیتا ہے کہ جس طرح بھوک انسان کا ایک بالکل فطری تقاضا ہے اور اسے پورا کرنے کے لیے وہ مختلف قسم کی سرگرمیوں میں منہمک رہتا ہے

بالکل اسی طرح وہ اپنے صنفی جذبات کی تسکین کے لیے مختلف قسم کے طریقے اختیار کرتا ہے اور ناچ اس لذت کے حاصل کرنے کا ہمیشہ ایک مؤثر ذریعہ رہا ہے۔ اسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے وہ رقمطراز ہے:۔

"نہ کتنا ہی حسین و جمیل جسم، جب کہ اس کے مختلف اعضا بھی نمایاں ہوں تماشائیوں کے سفلی جذبات کو لازمی طور پر بھڑکاتا ہے۔"

پھر وہ مخلوط ناچ کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

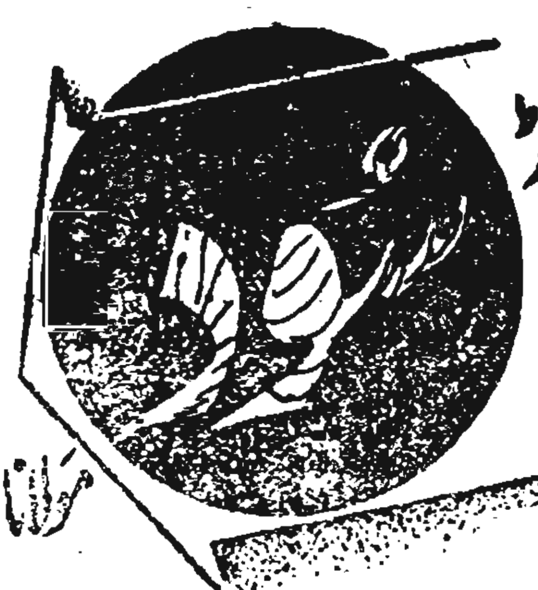
"جسموں کا ایک دوسرے کے ساتھ لمس صنفی میلانات کے اندر تحریک پیدا کرتا ہے ناچ کے دونوں شرکا بالکل غیر محسوس طور پر اپنے شہوانی احساسات کو ایک دوسرے کی طرف منتقل کرتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر بار نے اپنی کتاب میں ناچ اور گانوں کے بڑھتے ہوئے رجحانات پر بڑے بچے تلے انداز میں اظہارِ خیال کیا ہے اُس کا احساس یہ ہے کہ یہ ساری سرگرمیاں جنہیں لوگ ثقافت کے نام سے موسوم کرتے ہیں درحقیقت انسان کے سفلی جذبات کو مہمیز لگاتی ہیں۔ ان سے نہ تو انسانی فکر و نظر کو جلا ملتی ہے اور نہ ہی احساسات کی تہذیب ہوتی ہے۔

بے جا نہ ہوگا کہ ہم آخر میں ڈاکٹر بار کے اُن افکار کو بھی نقل کر دیں جو اُس نے "فیشن کی ستم رانیوں" کے تحت قلمبند کیے ہیں۔ وہ تنگ چُست اور نیم عُریاں لباسوں پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"نظر کے ذریعہ لوگوں کے شہوانی جذبات کو اگر سب سے زیادہ بھڑکایا جا سکتا ہے تو وہ جسم کی عریانی ہے۔ اس بنیادی حقیقت کو ذہن میں رکھتے ہوئے لوگوں نے ایسے لباس زیبِ تن کرنے شروع کر دیئے ہیں جن سے جسم کے بعض حصے پوری طرح نمایاں ہوتے ہیں اور اس فیشن نے ایک طوفان کی صورت اختیار کر لی ہے صنفِ نازک کے بازو بغلوں تک، ٹانگیں پنڈلیوں تک اور جسم کے اوپر کا حصہ کافی حد تک برہنہ ہوتا ہے اور مرد کی نگاہوں کی عین زد میں رہتا ہے۔ اس کی وجہ آخر کیا ہے۔ کیا یہ سب کچھ سفلی جذبات کی انگیخت کے لیے نہیں کیا جاتا؟"

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ
کی
نئی پیشکش



از
مولانا سید [illegible] مودودی

نہایت اہم مباحث کے اضافے اور مکمل نظر ثانی کے بعد

پہلی مرتبہ

نو ابواب — تین ضمیمے — ۰ا۴ صفحات

کتاب کے چند مباحث:

- اسلام، سرمایہ داری اور نظامِ اشتراکیت کا اصولی فرق
- حرمتِ سود، ۱- سلبی پہلو، ۲- ایجابی پہلو
- جدید بینکنگ — • سود کے متعلق اسلامی احکام
- کیا تجارتی قرضوں پر سود جائز ہے؟
- آڈیٹر جنرل حکومتِ پاکستان اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے درمیان قلمی مباحثہ
- ادارہ ثقافتِ اسلامی میں علماء اور جدید ماہرینِ اقتصادیات کے مابین سود کے متعلق آٹھ زیرِ بحث اہم سوالات کا مولانا مودودی کی طرف سے جواب

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ - ۱۱۔سی شاہ عالم مارکیٹ - لاہور